سلامی بیداری

انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں

علامہ یوسف القرضاوی

الصحوة الاسلامیه بین الجحود والتطرف باللغة الاردویة

اسلامی بیداری

انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں

الدکتور یوسف القرضاوی

ترجمہ
سلمان ندوی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۵۰۱

نام کتاب : اسلامی بیداری انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں
مصنف : ڈاکٹر یوسف القرضاوی
مترجم : مولانا سلمان ندوی
صفحات : ۲۸۸

ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵
فون: ۶۹۱۱۶۵۲ ، ۶۳۱۷۸۵۸ فیکس: ۶۸۲۰۹۷۵
E-Mail : mmipub @ nda.vsnl.net.in

اشاعت :

باراوّل: نومبر ۲۰۰۰ء ۱،۰۰۰

قیمت: -/۶۰ روپے

ISLAMI BEDARI (Urdu)
By Dr. Yusuf Al-Qarzawi
Translated by Maulana Salman Nadvi

Price : Rs. 60.00

مطبوعہ: بھارت آفسٹ، دہلی ۔ ۶

فہرست

فصل سوم

فصل چہارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

علامہ یوسف القرضاوی کی شخصیت عالمِ اسلام کے لئے کوئی انجانی نہیں، بلکہ جانی پہچانی اور معروف شخصیت ہے، دُنیائے اسلام میں مشکل ہی سے کوئی ایسا دین پسند حلقہ ملے گا جو آپ کے کام اور نام سے بالکل ہی آگاہ نہ ہو —— آپ کی پیدائش ۱۹۲۶ء میں مصر میں ہوئی، ابھی عمر کے دس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ قرآن پاک حفظ کرلیا، جامع ازہر میں دینی تعلیم کی تکمیل کی، ۱۹۷۳ء میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، بیس سے زائد کتابوں کے آپ مصنّف ہیں، دین پسند حلقوں میں ان کتابوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب "اسلامی بیداری —— انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں" آپ ہی کی کتاب " الصحوة الاسلامية بين الجحود والتطرف " کا اُردو روپ ہے۔

اتنی بات تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ مغربی استعمار جہاں جہاں بھی گیا —— وہاں وہاں لوگوں کو نہ صرف سیاسی غلامی کی بیڑیوں ہی میں جکڑا، بلکہ ان کے دل و دماغ کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی کہ لوگ غلامی کی بیڑیاں پہنانے والوں کو اپنا محسن بھی سمجھیں، دیکھیں تو انھیں کی آنکھوں سے دیکھیں سُنیں تو اُنھیں کے کانوں سے سُنیں — اور خوب و ناخوب کا فیصلہ انھیں کے

دماغ سے کریں۔ مختصر یہ کہ وہ افریشیائی قالب میں ایسی روح پیدا کرنا چاہتے تھے، جسے مغرب کی ہر چیز پسند ہو، ہر ادا پسند ہو، لیکن ایشیا اور افریقہ میں اسے کوئی چیز لائق توجہ نظر نہ آئے، تاکہ تہذیب و تمدّن میں، فکر و نظر میں، زندگی کی قدروں کے باب میں، انھیں رہنما اور معلم کی حیثیت حاصل ہو جائے، اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے استعماری طاقتوں نے تعلیمی نظام کو اپنے رنگ میں رنگا۔ دین اور دینی تعلیم کو سرکاری تعلیم گاہوں سے الگ تھلگ کر کے پڑھے لکھے لوگوں کی ایسی کھیپ تیار کرنا شروع کر دی جو ان کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے سہارا بن سکے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سیاسی آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی ان خطوں میں فکری استعمار کی چھاپ باقی ہے۔

چنانچہ دینی تعلیم و تربیت اور دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کے نتیجہ میں مسلم نوجوانوں کے اندر اسلامی بیداری کی لہر پیدا ہوئی تو استعماری نشریات ہی نے نہیں خود مسلم ملکوں میں بھی ارباب حل وعقد نے ان نوجوانوں پر رجعت پسندی، انتہا پسندی اور دہشت پسندی کی تہمتیں لگا کر اس بیداری کا گلا گھوٹنا چاہا، نماز پڑھنا، داڑھی رکھنا یا لڑکیوں کا پردہ کرنا بھی انتہا پسندی کی علامت بن گیا — نقاب استعمال کرنے والی لڑکیوں پر تعلیم گاہوں کے دروازے بند کر دئے گئے، دین پسندوں کے لئے سرکاری نقطۂ نظر سے جیل کے باہر کوئی مناسب جگہ نہیں رہی، ہزاروں نوجوانوں کو جیل میں ڈال دیا گیا، جلیل القدر علماء کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ صرف اس جرم میں کہ یہ اسلام کو پسند کرتے تھے، اسلام کا پرچار کرتے تھے اور اسلام ہی کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد اور اساس بنانا چاہتے تھے، لیکن انھیں اس کی اجازت نہیں تھی۔ جب کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے پرچار پر کوئی پابندی

نہ تھی، نہ ہے اور ان لوگوں کو آج بھی اجازت ہے کہ یہ اپنی تنظیمیں بنائیں، اپنے نظریات کا پرچار کریں۔ اور اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ ساری چیزیں اسلام پسندوں کے لئے ممنوع ہیں۔

ان نوجوانوں کو جیلوں میں جو جسمانی سزائیں دی گئیں، ذہنی اذیتیں پہنچائی گئیں، انھیں پڑھ اور سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اربابِ حل وعقد کے اسی انتہا پسندانہ رویہ نے جیلوں میں انتہا پسندی کو جنم دیا، تشدّد سے تشدّد ہی کو بڑھاوا ملتا ہے چنانچہ چند نیم پختہ ذہن نوجوان ردّ عمل کا شکار ہو گئے اور پھر دنیا میں زور و شور سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ یہ نوجوان جو اپنے آپ کو دین پسند اور محبِ اسلام کہتے ہیں، یہ تو انتہا پسند اور دہشت پسند ہیں۔ لیکن اس بات کی نشان دہی کوئی نہیں کرتا کہ یہ انتہا پسندی کس کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، تاکہ اس کا صحیح مداوا ہو سکے۔ پھر طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ عالمی نشریاتی ذرائع کو لبنان میں مسیحیوں کی فلسطین میں صہیونیوں کی اور دوسرے ممالک میں دوسرے گروہوں کی انتہا پسندی اور دہشت پسندی نظر نہیں آتی لیکن مسلمان نوجوانوں میں اگر دینی رجحان پیدا ہو جائے اور وہ نماز روزہ کی پابندی کرنے لگیں تو ان ذرائع کو ان کے اس رویہ میں بھی انتہا پسندی نظر آنے لگتی ہے اس لئے کہ ان ذرائع پر جن کا کنٹرول ہے وہ نہیں چاہتے کہ اسلام جسے وہ ملک بدر کر چکے ہیں، اپنے ہی ملک میں پھر واپس آجائے۔

اس کتاب میں یہ بات تفصیل سے بتائی گئی ہے کہ دین کی روح، اسلام کی تعلیم۔ انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتی ــــ اور اگر کچھ نوجوان ردعمل کے طور پر انتہا پسندی کا شکار ہو گئے ہیں تو انہیں تشدد کے ذریعہ نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر راہ اعتدال پر لایا جا سکتا ہے لیکن یہ کام ان ہی لوگوں کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے ــــ جن کی

زندگیاں تضاد سے پاک ہوں، اور نوجوانوں کو ان کے علم اور دین داری پر اعتماد ہو۔
کتاب کے ہر لفظ یا مصنّف کی ہر رائے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں
لیکن کتاب میں زیر بحث مسئلہ 'انتہا پسندی' کے مختلف پہلوؤں کو کتاب وسنت کی روشنی میں اجاگر کر کے مصنف نے عالم اسلام کے ایک زندہ اور الجھے ہوئے مسئلہ کے حل کی جو راہ دکھائی ہے۔ یقیناً دین پسند حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا!

مترجم
سلمان ندوی

فصل اوّل

انتہا پسندی ـــــ سچائی کیا ہے

علمائے منطق کا کہنا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں جیسا تصوّر ہوتا ہے، ویسا ہی اس پر حکم بھی لگایا جاتا ہے، کیوں کہ کسی مجہول اور انجانی چیز پر کوئی حکم لگانا ممکن نہیں ہوتا جس چیز کے بارے میں یہی نہ معلوم ہو کہ اس کی ماہیئت کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے، اس پر کوئی حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ دینی انتہا پسندی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی نمایاں علامتیں کیا ہیں؟

لغوی مفہوم

درمیان سے دُور ہٹ کر، کنارے کھڑے ہونے کو "تطرف" کہتے ہیں، اصلاً اس لفظ کا استعمال شروع شروع میں محسوس اور مرئی چیزوں کے لئے ہوتا تھا، مثلاً کنارے بیٹھنا، کنارے چلنا، لیکن پھر بعد میں اس کا استعمال معنوی چیزوں کے لئے بھی ہونے لگا، مثلاً دینی انتہا پسندی، فکری اور نظریاتی انتہا پسندی سلوک اور رویّہ میں انتہا پسندی۔

انتہا پسندی کے لازمی نتائج

انتہا پسندی اور غلو کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی امن اور سلامتی سے دور اور ہلاکتوں اور خطروں سے قریب ہو جاتا ہے، اسی مفہوم کو ایک شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے:

"وہ ایک محفوظ مقام پر تھا لیکن مصیبتوں نے اسے گھیر لیا اور اب وہ تباہی کے کنارے پر آگیا ہے۔"

اسلام کی دعوت اعتدال پسندی اور غلو سے پرہیز کی دعوت ہے

اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے، ہر چیز میں اعتدال، تصوّر اور عقائد میں، عبادت اور زہد میں، اخلاق اور رویّہ میں، معاملات اور قانون سازی میں، اسی راہ کا نام اللہ نے "صراطِ مستقیم" رکھا ہے، یہ راہ ان دینی اور فکری گروہوں کی راہ سے الگ ہے۔ جن پر اللہ کا غضب ہوا یا جو راہ پانے کے بعد کھو بیٹھے اور جن کی راہوں پر غلو اور افراط و تفریط کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔

اسلام کی عمومی خصوصیات میں میانہ روی اور اعتدال پسندی ایک اہم ترین خصوصیت ہے نیز راہِ اسلام کی بنیادی نشانیوں میں یہ وہ اہم نشانِ راہ ہے جسے اللہ نے دوسری ملتوں کے مقابلہ میں اُمّتِ مسلمہ کا وصف قرار دیا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو امّت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے

لوگوں پر گواہ رہو (البقرہ-۱۴۳)

پس امتِ مسلمہ وہ انصاف اور اعتدال پسند امت ہے، جسے صراطِ مستقیم سے دائیں بائیں ہٹی ہوئی گمراہی اور ضلالت کے خلاف دنیا اور آخرت میں گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔

قرآن وحدیث میں انتہا پسندی کی تعبیر لفظ "غلُو" سے کی گئی ہے

اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، انتہا پسندی سے خبردار کرتا ہے، نیز اس کے لئے قرآن اور حدیث میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان میں "غلو"، تنطع اور تشدید کے الفاظ بھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص پر جن لوگوں کی نگاہ ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام غلو کو انتہائی ناپسند کرتا ہے نیز لوگوں کو اس سے شدت کے ساتھ خبردار کرتا ہے۔

آیئے اب ہم یہ حدیث پڑھیں۔ یہ ہمارے لئے کافی ہے، اس سے ہم یہ جان لیں گے کہ اسلام کس حد تک لوگوں کو "غلو" سے روکتا ہے اور اس کے خوفناک انجام سے آگاہ کرتا ہے۔

۱۔ امام احمدؒ نے اپنی مسند میں امام نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں اور حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایاکم والغلو فی الدین، تم دین میں غلو کرنے سے بچو، تم سے

فانما ھلک من قبلکم بالغلو فی الدین — پہلے کے لوگ دین میں غلو ہی کے باعث ہلاک ہوئے

(شاکرؒ کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح ہے، المناوی نے 'الفیض' میں (ج ۳، ص ۱۲۶ ابن تیمیہؒ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی سند امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے)

اس حدیث میں " قبلکم " کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد سابقہ ادیان کے ماننے والے اہلِ کتاب ہیں اور ان میں خاص طور سے نصاریٰ مراد ہیں قرآن کا یہ خطاب انہیں لوگوں سے ہے۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا أَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾

کہو، اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو، جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سواء السبیل سے بھٹک گئے۔ (المائدۃ - ۷۷)

ان آیات میں ہم کو نصاریٰ کی طرح دین میں غلو کرنے سے روکا گیا ہے اور خوش بخت تو وہی ہے جو دوسروں کے انجام سے نصیحت اور عبرت حاصل کرے۔

اوپر جو حدیث 'ایاکم والغلو فی الدین' نقل ہوئی ہے، اس کا پس منظر اس اہم حقیقت سے ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ 'غلو' کی ابتدا چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہوتی ہے پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور اس کی چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں۔

اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ پہنچے تو آپؐ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا:

"منیٰ میں رمی جمار کے لئے کنکریاں لاؤ"۔

حضرت ابن عباسؓ نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں چن کر آپؐ کو دیں، آپؐ نے ان کنکریوں کو ہاتھ میں لے کر فرمایا:

نعم بامثال ھولاء، ایاکم والغلو فی الدین

فانما ھلک من قبلکم بالغلو فی الدین

ہاں، ایسی ہی کنکریاں اور تم دین میں غلو سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ دین میں غلو ہی کے باعث ہلاک ہوئے، یعنی لوگوں کو شدت اور انتہا پسندی کا رویّہ نہیں اپنانا چاہیئے اور نہ یہ کہنا چاہیئے کہ رمی جمار میں بڑی کنکریوں کا استعمال زیادہ پُر تاثیر اور زیادہ بہتر ہے، اسی ذہنی رخ سے دھیرے دھیرے 'غلو' کے جذبہ کی آبیاری ہوتی ہے، اسی لیئے آپ نے اس سے خبردار کیا اور بچنے کی تاکید فرمائی۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں " ایاکم والغلو فی الدین" عام ہے اور اس کا تعلق عقائد اور اعمال دونوں ہی سے ہے۔ 'غلو' کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اور نصاریٰ کے اندر تمام دینی گروہوں کے مقابلہ میں زیادہ 'غلو' تھا، عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی، اسی لیئے قرآن نے خاص طور پر ان کو 'غلو' سے منع کیا۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ ‏ اے اہل کتاب دین میں غلو کرنے سے بچو۔

(النساء - ۱۷۱)

۲۔ صحیح مسلم میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھلک المتنطعون۔ آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا امام نوویؒ نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بال کی کھال نکالتے ہیں، شدت پسندی کا رویّہ اپناتے ہیں اور اپنے اقوال و اعمال میں حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

اس حدیث میں اور اس سے پہلے جو حدیث گزر چکی ہے، دونوں میں یہ

بات کہی گئی ہے کہ 'غلو' اور 'تنطع' کا انجام ہلاکت ہے۔ دنیا اور دین دونوں کی ہلاکت پھر اس ہلاکت اور تباہی سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ انجام ہی اس سے چونکا دینے کے لئے کافی ہے۔

۳۔ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک رضؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشددوا علی انفسکم، فیشدد علیکم فان قوماً شددوا علی انفسھم، فشدد علیھم، فتلك بقایاھم فی الصوامع والدیارات،

اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ یہ سختی تم پر لازم کردی جائے گی ایک گروہ نے (انتہا پسندی کا رویہ اپنا کر) اپنے اوپر سختی کی تو اس پر سختی کی گئی، اس گروہ کے بچے ہوئے باقی افراد صوامع اور راہب خانوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ
(سورۃ الحدید: ۲۷)

ان لوگوں نے رہبانیت ایجاد کی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہیں قرار دیا تھا

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو دینداری کے سلسلہ میں ہر ایسے رویہ پر ٹوکا جس میں 'غلو' کی طرف رجحان پایا جاتا تھا، صحابہ کرامؓ میں جن لوگوں نے عبادت اور زہد کے معاملہ میں مبالغہ کا ایسا رخ اپنایا جو اسلام کی راہ اعتدال سے میل نہیں کھاتا تھا تو آپؐ نے ان کے اس غیر معقول رویہ پر نکیر فرمائی، آپؐ نے روحانیت اور مادیت میں توازن اور دین و دنیا میں یگانگت پیدا کی، آپؐ نے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ اس دنیا کی زندگی میں انسان کا کیا حصہ ہے۔ اور بندگی اور عبادت میں پروردگار کا کیا حق ہے کہ

اسی بندگی کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

اسلام نے جو عبادتیں فرض کی ہیں وہ فرد کے نفس کو پاک کرتی ہیں، اسے روحانی بلندی اور مادی ترقی سے ہم کنار کرتی ہیں، اس طرح پورے سماج کو بلندی حاصل ہوتی ہے، بھائی چارہ کی روح پیدا ہوتی ہے۔ ہر فرد دوسرے کا ہمدرد اور غم گسار ہوتا ہے، لیکن یہ روح اور جذبہ انسان کو زمین کی آبادکاری کی مہم سے غافل نہیں کرتا۔ پس نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ایک ہی وقت میں انفرادی عبادتیں بھی ہیں اور اجتماعی بھی، یہ عبادتیں نہ کسی مسلمان کو زندگی کی تگ و دو سے الگ تھلگ کرتی ہیں نہ سماج سے، بلکہ شعوری اور عملی طور سے یہ سماج سے اس کے ربط اور تعلق کو اور بڑھاتی ہیں، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو مشروع نہیں قرار دیا ہے جو انسان پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ گوشہ گیری اور عزلت کی زندگی گزارے اور دنیا کی زندگی اور اس کی اچھائیوں سے الگ تھلگ رہے، اس کی ترقی اور فروغ میں کوئی حصہ نہ لے۔ رہبانیت کے برخلاف اسلام اس پورے کرۂ ارضی کو مومن کے لئے ایک وسیع اور بڑی محراب قرار دیتا ہے اور اس میں عمل کو وہ عبادت اور جہاد سے تعبیر کرتا ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو اور حدود اللہ کی پابندی کی گئی ہو

دوسرے اَدیان اور فلسفے، روحانی زندگی کی کامیابی کے لئے، روح کی صفائی، پاکیزگی، ترقی اور آخرت کی فلاح کے لئے۔ مادّی زندگی سے غفلت برتنے، بدن کو راحتوں سے محروم رکھنے اور دنیا کی اہمیت کو گھٹانے کی جو دعوت دیتے ہیں، اسلام اسے تسلیم نہیں کرتا بلکہ ان تمام باتوں کے سلسلہ میں وہ انسانوں کو اعتدال اور توازن برقرار رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

پروردگار ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی اچھائیاں عطا فرما (البقرہ ۔ ۲۰۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمۃ امری، واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی، واصلح لی آخرتی التی الیھا معادی (مسلم)

بارے الٰہا میرے لئے میرے دین کو درست کر دے کہ اسی میں میرے معاملہ کی درستگی اور حفاظت ہے اور میرے لئے میری دنیا کو درست کر دے کہ اسی میں میری روزی ہے اور میرے لئے میری آخرت کو درست کر دے کہ وہیں مجھے لوٹ کر جانا ہے (مسلم)

ان لبدنك علیك حق

(البخاری ۔ مسلم)

بے شک تمہارے بدن کا تم پر حق ہے ۔ (بخاری ۔ مسلم)

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ان لوگوں پر شدّت سے نکیر کی ہے جن کے اندر بندوں کے لئے اللہ کی پیدا کی ہوئی، کھانے، پینے اور زینت کی پاک اور حلال چیزوں کو حرام قرار دینے کا رجحان پایا جاتا تھا، چنانچہ قرآن کی مکّی سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ

اے بنی آدم ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے نبی ان سے کہو کس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا ، جسے، اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ (الاعراف ۔ ۳۱)

اسی طرح مدنی سورۃ المائدۃ میں مومن بندوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں جو کچھ حلال اور طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو، اور خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو، جس پر تم ایمان لائے ہو

(سورۃ المائدہ ۸۷-۸۸)

یہ دونوں آیتیں جہاں اہلِ ایمان کے سامنے، کھانے پینے اور زیب و زینت کی چیزوں کے بارے میں اسلام کی حقیقی راہ کو اجاگر کرتی ہیں وہیں وہ اس غلو کی مخالفت بھی کرتی ہیں جو مختلف ادیان میں پایا جاتا ہے۔ ان آیتوں کے اسباب نزول کے سلسلے میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ صحابۂ کرام میں سے ایک گروہ نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم اپنے آلہ تناسل کو کاٹ دیں گے اور دنیا کی خواہشات کو ترک کرکے راہبوں کی طرح دنیا میں گھومتے رہیں گے۔

ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ شادی نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو خصی کرکے جوگیا لباس پہن لیں گے۔ تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

نیز حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا :

یارسول اللہ انی اذا اکلت من ھذا

اے اللہ کے رسول، میں جب یہ گوشت

اللحم انتشرت للنساء، وانی حرمت علیّ اللحم

کھاتا ہوں تو جنسی خواہش تیز ہو جاتی ہے لہٰذا میں نے اپنے اوپر یہ گوشت حرام قرار دے دیا ہے

چنانچہ اسی سلسلہ میں یہ آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا ...... نازل ہوئی، ان روایتوں کا ذکر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے

اُن اناساً من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم سألوا ازواج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم عن عملہ فی السر فکانھم تقالوھا۔ فقال بعضھم لا اٰکل اللحم وقال بعضھم لا اتزوج النساء وقال بعضھم لا انام علی فراش فبلغ ذلک النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم فقال مابال اقوام یقول احدھم کذا وکذا ولکنی اصوم وافطر وانام واقوم واٰکل اللحم واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

کچھ لوگوں نے ازواج مطہراتؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم گھر کی تنہائیوں میں کیا کرتے ہیں۔ پھر ازواج مطہراتؓ کا جواب سن کر ان لوگوں نے آپؐ کے عمل کو قلیل سمجھا۔ پھر ان لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ میں کبھی گوشت نہیں کھاؤں گا، کسی نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا، کسی نے کہا، میں بستر پر نہیں سوؤں گا، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کیا بات ہے کچھ لوگ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں حالانکہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں، نیز میں گوشت بھی کھاتا ہوں اور شادیاں بھی کرتا ہوں پس جو شخص میری سنت کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

یہاں آپ کی سنّت سے مراد، فہم دین اور اسے برتنے اور عملی روپ دینے میں آپؐ کا اسلوب اور طریقہ ہے، یعنی آپ کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ

اپنے نفس کے ساتھ اپنے گھر والوں اور عام لوگوں کے ساتھ کیسا ہے، کس طرح اعتدال اور توازن کے ساتھ آپ ہر ایک کا حق ادا کرتے ہیں۔

دین میں غلو سے پیدا ہونے والی خرابیاں اور آفتیں

دین میں انتہاپسندی اور غلو سے سختی سے روکا گیا ہے، اس لئے کہ یہ انتہاپسندی اور غلو اپنے ساتھ کچھ خرابیاں، عیوب اور آفتیں بھی لے کر آتا ہے۔ جہاں غلو کا رویہ پایا جائے گا وہاں لازماً یہ خرابیاں اور آفتیں بھی ابھر کر سامنے آجائیں گی۔

پہلی خرابی

غلو کا یہ رویہ طبیعتوں میں وحشت کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور یہ فطری طور پر انسانوں کے لئے ناپسندیدہ اور ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اگر اسے برداشت بھی کرتے ہیں تو وہ تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں۔ عام لوگ نہیں، جب کہ شریعتوں کے مخاطب سب ہی لوگ ہوتے ہیں، وہ سارے انسانوں کو مخاطب کرتی ہیں، ان کا خطاب خاص صلاحیت رکھنے والے گروہوں تک محدود نہیں ہوتا۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے بزرگ صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر اس وقت خفگی کا اظہار کیا، جب انہوں نے نماز پڑھاتے وقت لمبی قرأت کی اور کسی نمازی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس کی شکایت کی ـــــــ

شکایت سن کر آپؐ نے حضرت معاذؓ سے کہا۔

اے معاذؓ تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو۔ آپؐ نے ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے ان کلمات کو تین بار دہرایا۔ (البخاری)

اسی سے ملتے جلتے ایک اور واقعہ میں آپؐ نے ایک امام پر شدید ترین خفگی کا اظہار کیا اور فرمایا۔

تم میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں اکتاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ جو لوگوں کی امامت کرے، اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہیئے اس لئے کہ اس کے پیچھے بوڑھے کمزور اور ضرورت مند لوگ ہوتے ہیں۔ (البخاری)

انہیں باتوں کے پیش نظر جب آپؐ نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ کو یمن روانہ فرمایا تو یہ نصیحت کی:

نرمی کرنا، سختی نہیں۔ خوش خبری سنانا، متنفر نہ کرنا۔ مل جل کر رہنا، باہمی اختلاف سے بچنا۔ (متفق علیہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اللہ کو اللہ کے بندوں میں مبغوض نہ بناؤ۔ تم میں سے جب کوئی امام ہوتا ہے تو لوگوں پر نماز کو اتنی لمبی کر دیتا ہے کہ وہ ان کے لئے ناپسندیدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری خرابی

انتہا پسندی اور غلو کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، ہمیشہ ہمیش کے لئے

غلو کی راہ پر چلنا اور اسے عادت بنا لینا آسان نہیں ہے، انسان اکتا جانے والی مخلوق ہے اس کی طاقتیں بھی محدود ہیں۔ اگر سختی اور دشواری پر ایک دن صبر کر لیتا ہے تو جلد ہی اس کی سواری ــــ جسمانی قوتیں ــــ تھک جاتی ہیں اور وہ آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے اس کے اندر اکتاہٹ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عمل چھوڑ بیٹھتا ہے اور تھوڑا سا لگاؤ بھی اس سے باقی نہیں رکھتا ــ یا پھر بالکل دوسرا راستہ اپنا لیتا ہے۔ افراط سے تفریط کی طرف چلا جاتا ہے۔ شدت پسندی اور غلو کی راہ چھوڑ کر شریعت سے ڈھیل اور آزادی کی راہ اپنا لیتا ہے۔ اللہ اس آزادروی سے محفوظ رکھے۔

اکثر و بیشتر میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو شدّت اور انتہا پسندی میں مشہور تھے پھر ساتھ چھوٹ گیا، میں کہیں چلا گیا، وہ کہیں چلے گئے۔ پھر ایک مدّت کے بعد۔ جب میں نے ان لوگوں کے بارے میں لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی راہ بدل لی ہے اور اب ایک اور ہی راہ کے راہی بن گئے ہیں۔ العیاذ باللہ ــــ یا پھر ان لوگوں میں سستی کی ایسی کیفیت پیدا ہوئی جس کا اشارہ حدیث شریف میں آیا ہے[1] کہ نہ مسافت ہی طے ہوئی اور نہ سواری ہی باقی رہی، ساتھی بھی چھوٹ گئے اور سواری بھی تھک کر چور ہو گئی۔

اب اسی پس منظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے۔

1037

---

[1] یہ حدیث البزّار نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے سند ضعیف ہے۔

اپنے آپ کو اتنے ہی عمل کا مکلّف بناؤ جس کی طاقت اور سکت رکھتے ہو اس لئے کہ اللہ نہیں اکتاتا لیکن تم اکتا جاؤ گے ...

بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر مداومت برتی جائے چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو[1]

حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک (باندی) خادمہ تھی۔ وہ دن میں روزہ رکھتی اور رات نمازوں میں گزارتی، آپ کو جب اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ وہ صیام و قیام کی پابند ہے تو آپؐ نے فرمایا:

ہر کام میں تیزی اور سرگرمی کی کیفیت ہوتی ہے پھر اس میں ڈھیل اور فتور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پس جس کی ڈھیل کا رُخ میری سنّت کی طرف ہو تو اس نے راہ ہدایت پالی لیکن جس کی ڈھیل کا رُخ کسی اور طرف ہو تو اس نے راہ راست گم کر دی[2]

اسی حدیث کی روایت طبرانی نے کی ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ:

"جس کی ڈھیل کا رُخ میانہ روی کی طرف ہو تو وہ بہت خوب اور بہتر ہے لیکن جن لوگوں کی ڈھیل کا رُخ معصیت کی طرف ہوتا ہے تو وہ لوگ ہلاک ہونے والے ہیں"

اور ہاں، یہ کتنی اچھی اور خوب صورت نصیحت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تمام لوگوں کے لئے کی ہے۔ میانہ روی اور اعتدال کی نصیحت۔

---

[1] یہ حدیث امام بخاریؒ، مسلمؒ، ابو داؤدؒ اور نسائیؒ نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کی ہے۔

[2] البزار نے اس حدیث کو صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

تاکہ لوگ دین پر غلبہ پانے کی کوشش نہ کریں ورنہ وہ انھیں مغلوب کر دے گا، اور اگر وہ سختی سے اس کا مقابلہ کریں گے تو وہ ان پر غالب آئے گا اور انھیں پسپائی نصیب ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

دین آسان ہے اور جو انتہا پسندی کا رویہ اپنائے گا تو وہ مغلوب ہو جائے گا، پس سیدھی اور میانہ روی کی راہ اپناؤ اور بشارت حاصل کرو۔ (بخاری، مسلم)

اس حدیث کی شرح میں علاّمہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ:

"جب کوئی شخص راہبوں کی طرح عبادت میں تعمّق کا رویّہ اپناتا ہے اور نرمی کی راہ چھوڑ دیتا ہے تو آخر میں وہ عاجز اور مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے پس افراط اور تفریط سے بچ کر درست رویّہ اپناؤ۔ اور اگر اکمل پر عمل ممکن نہ ہو تو میانہ روی کی وہ عملی راہ اپناؤ جو اس سے قریب ہو اور اس عمل پر بشارت حاصل کرو۔ جس پر مداومت برتتے رہو، خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔"

تیسری خرابی

انتہا اور شدّت پسندی کا یہ رویّہ جہاں پایا جاتا ہے وہاں ذمّہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی بھی ہوتی ہے اور دوسرے بہت سارے حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں۔ کیا ہی سچی بات ہے جو کسی دانا نے کہی ہے کہ جس جگہ اسراف کا مظاہرہ ہوتا ہے تو اسی کے پہلو میں کوئی حق بھی ضائع ہوتا ہے . . . چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک یہ خبر پہنچی کہ عبداللہ بن عمرؓو عبادت میں اتنے

مشغول ہو گئے ہیں کہ اب گھر والوں کے حقوق بھی بھول گئے ہیں۔ تو آپؐ نے ان سے کہا۔ تم دن میں روزے رکھتے ہو اور رات میں نمازیں پڑھتے ہو؟

عبداللہؓ نے عرض کیا۔ ہاں، یارسول اللہ۔

آپؐ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرو۔ روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، سوؤ بھی اور جاگو بھی، اس لئے کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور جو لوگ تم سے ملنے آتے ہیں ان کا بھی تم پر حق ہے۔ (بخاری کتاب الصوم)

آپؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کا حق ادا کیا جائے اور کسی ایک رُخ پر اتنا غلو نہ کیا جائے کہ دوسرے پہلو متاثر ہو کر رہ جائیں۔

اسی طرح کی بات فقیہہ صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنے دینی اور عابد و زاہد بھائی حضرت ابوالدرداءؓ سے کہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کو الفت و محبت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ اس باہمی تعلق میں تکلف کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، چنانچہ ایک دن حضرت سلمانؓ ابوالدرداءؓ سے ملنے کے لئے ان کے گھر پر گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ اُمّ الدرداءؓ حضرت ابوالدرداءؓ کی شریکِ حیات پھٹے پرانے کپڑوں میں ہیں اور شادی شدہ عورتیں جس طرح زیب و زینت کا خیال رکھتی ہیں اس طرح کی کوئی چیز ان کے جسم پر نہیں ہے۔ تو آپؓ نے ان سے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟

حضرت ام الدرداءؓ نے کہا۔ آپؓ کے بھائی ابوالدرداءؓ کو دنیا کی کوئی حاجت نہیں ہے! یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں خود حضرت ابوالدرداءؓ آ گئے۔ حضرت سلمانؓ کو خوش آمدید کہا پھر کھانا لے کر آئے اور حضرت

سلمان رضؓ سے کہا۔ آپ رضؓ کھانا کھائیں میں روزہ سے ہوں۔ حضرت سلمان رضؓ نے کہا۔ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک کہ آپ نہ کھائیں۔ البزّار کی روایت میں ہے کہ حضرت سلمان رضؓ نے قسم دے کر انہیں افطار کرایا اور پھر کھانا کھایا، پھر جب رات آئی تو حضرت ابوالدرداء رضؓ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، حضرت سلمان رضؓ نے کہا ابھی سو رہیے۔ حضرت ابوالدرداء سو گئے پھر تھوڑی دیر بعد نماز پڑھنے کے لئے اٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمان رضؓ نے پھر انہیں سونے کے لئے کہا، پھر جب رات کا آخری حصّہ آیا تو حضرت سلمان رضؓ نے کہا۔ اٹھو اب نماز پڑھیں۔ پھر دونوں بزرگوں نے تہجد کی نماز پڑھی۔ پھر حضرت سلمان رضؓ نے حضرت ابوالدرداء رضؓ سے کہا۔

تمہارے رب کا تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے، ہر ایک کا حق ادا کرو۔ پھر حضرت ابوالدرداء رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ساری باتیں عرض کیں۔ آپ نے ان باتوں کو سُن کر کہا: سلمان رضؓ نے سچ کہا (بخاری، ترمذی) ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان رضؓ نے علم دین سے سیری حاصل کی ہے۔ اب ہم پھر نفس موضوع کی طرف پلٹتے ہیں کہ دینی انتہاپسندی کا مفہوم کیا ہے؟ اور اس وقت اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی نشانیاں کیا ہیں؟ اور کب کسی آدمی کو دینی لحاظ سے انتہاپسند قرار دیا جا سکتا ہے؟

دینی انتہاپسندی کا مفہوم اور اس کی بنیادیں

اس انتہاپسندی کی توضیح و تشریح کرنا اور علم و بصیرت کی روشنی میں

اس کے مفہوم کو متعیّن کرنا، مرض کے علاج کی راہ کا پہلا قدم ہے، تاکہ دلیل کے اُجالے میں جو ہلاک ہونا چاہے ہلاک ہو اور جو زندہ رہنا چاہے زندہ رہے لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس سلسلہ میں کسی بیان یا کسی حکم کی کوئی قیمت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ حقیقی اسلام سے، اسلامی نصوص اور شریعت اسلامی کے مسلّمہ قواعد سے مربوط ہوتا ہے، صرف تمہاری رائے یا کسی کا قول یا لوگوں کا کوئی اعلان اس باب میں حجّت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اللہ کے مقابلہ میں کسی اور کی بات کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

(سورۃ النساء ۵۹)

پوری امّت کا — سلف اور خلف کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ردوا الی اللہ والرسول سے مراد اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت ہے۔ جن نوجوانوں پر انتہا پسندی کی تہمت لگائی جاتی ہے، ان سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں کتاب وسنّت کی شرعی توثیق کے بغیر کسی فتوے یا کسی بات پر کوئی توجہ دیں گے۔ بلکہ وہ ان تہمتوں کو دیوار پر مار پھینکیں گے اور خود تہمت لگانے والوں پر جعل سازی کی تہمت عائد کریں گے۔ اور کہیں گے کہ دینی طرزِ زندگی کو انتہا پسندی کا نام دینا — ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کو رات کہے اور سایہ کو دھوپ۔ تسمیۃ الاشیاء بغیر اسماءھا،

بات پرانی ہے حضرت امام شافعیؒ پر رِفض کی تہمت لگائی گئی، اس سستی تہمت سے امام اہلِ سنت کو جو ذہنی پریشانی ہوئی ہوگی وہ ظاہر وباہر ہے، آپ نے تہمت لگانے والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

ان کان رفضا حب آل محمد　　فلیشھد الثقلان انی رافضی

اگر آل محمدؐ کی محبّت رِفض ہے تو جن وانس کو گواہی دینی چاہیئے کہ میں رافضی ہوں۔

اور ابھی حال ہی میں ایک داعی نے کہا:

اللھم ان کان المتمسک بالکتاب والسنۃ رجعیا فأحینی اللھم رجعیا، وأمتنی رجعیا، واحشرنی فی زمرۃ الرجعیین

بارے الٰہا اگر کتاب وسنّت سے گہری وابستگی رجعت پسندی ہے ـــــ تو مجھے رجعت پسند ہی بنا کر زندہ رکھ اور رجعت پسندی کی حالت میں میری موت ہو اور حشر کے دن رجعت پسندوں ہی کے گروہ میں مجھے اٹھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کل لوگوں کی زبان پر رجعت پسندی، انتہا پسندی، جمود اور تعصّب کے جو الفاظ چڑھے ہوئے ہیں ان کے مفہوم کی وضاحت اور تحدید نہایت ضروری ہے، انہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیئے کہ ہر گروہ اپنی پسند کے مطابق انھیں استعمال کرے۔ اگر ایسا ہوا تو دائیں بائیں بازو والے تمام فکری گروہ اور اجتماعی حلقے اپنی اپنی پسند کے مطابق جیسے اور جو چاہیں گے ان کی شرح کریں گے۔

اور یہاں پہنچ کر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دینی انتہا پسندی کے مفہوم کی وضاحت اور تحدید کا کام اگر لوگوں کی رائیوں اور خواہشوں پر چھوڑ دیا جائے گا تو اس سے انتشار پھیلے گا اور ہماری راہیں الگ الگ ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ یہاں خواہشیں بے شمار ہیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ

اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا (المؤمنون ۷۱)

دو اہم اور قابل توجہ باتیں

اب میں دو اہم باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں ان دونوں باتوں کا ہمارے زیر بحث موضوع سے گہرا تعلق ہے۔

پہلی بات

کسی پر انتہا پسندی، میانہ روی یا آزادی کا حکم لگانے سے پہلے اس کے سماج اور ماحول پر نگاہ ڈالنی چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سماج یا ماحول میں دین داری کی کیا کیفیت ہے دینی جذبہ عمل میں ضعف پایا جاتا ہے یا توانائی؟ انھیں باتوں کے پیش نظر کسی آدمی کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

ایسے افراد مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جن پر دین کی گہری چھاپ

پڑی ہوتی ہے۔ ان کا معمول بھی دینی احکام کی پابندی میں شدید ہوتا ہے کسی دینی حکم کی مخالفت یا بجا آوری میں کوتاہی ان کے لئے ناگوار ہوتی ہے اس سلسلہ میں وہ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان ایسا نظر آتا ہے جس کی زندگی قیام لیل یا صیام نہار سے خالی ہوتی ہے تو انھیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔

اسی کیفیت کا اظہار اس قول ماثور میں کیا گیا ہے۔

حسنات الابرار، سیئات المقربین

نیکوں کی اچھائیاں، مقربین کی برائیاں شمار ہوتی ہیں۔

اس موقع پر مجھے حضرت انس بن مالک رضؓ کا وہ قول بھی یاد آرہا ہے جو انھوں نے اپنے ہم عصر تابعین رضؓ سے کہا تھا۔

تم لوگ ایسے کام بھی کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں لیکن ہم انھیں کاموں کو عہدِ رسالت میں تباہ کن اور ہلاکت میں ڈالنے والا سمجھتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ لبید بن ربیعہ کا ایک شعر پڑھا کرتی تھیں، جس کا مفہوم یہ ہے:

"وہ لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے، جن کے پڑوس میں زندگی گزاری جاتی تھی اور اب تو میں ایسے لوگوں میں رہ گیا ہوں جن کے لئے میرا وجود ناپسندیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے صحت مند لوگوں میں کوئی خارش زدہ آ گیا ہو۔"

ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں: اللہ کی رحمت ہو لبید پر، اگر وہ

ہمارے دور میں آج تک زندہ رہتے تو ان کا احساس کیا ہوتا ؟ اس طرح ام المومنین کے بھتیجے حضرت عروۃ بن الزبیرؓ جو ام المومنین کے بعد ایک مدت تک زندہ رہے۔ یہی شعر پڑھتے تھے اور کہتے تھے اللہ کی رحمت ہو لبید پر اور عائشہؓ پر اگر ان کو ہمارا آج کا زمانہ ملتا تو کیا احساس ہوتا ؟

اس کے مقابلہ میں ہم اس شخص کو دیکھتے ہیں جس کی دینداری کا توشہ علم و عمل کے لحاظ سے کم ہو گیا ہے یا ایسے ماحول میں رہتا ہے جس میں حرام چیزوں کا ارتکاب اور اللہ کی شریعت کا انکار کیا جاتا ہے، تو ایسا آدمی دین کی معمولی پابندی کو بھی تعصب اور شدت پسندی شمار کرتا ہے۔

اس طرح اس کی دین سے جتنی دوری بڑھتی جائے گی، دین اس کے لیے اتنا ہی اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اس کے لئے دینی احکام سے اعراض عام شیوہ ہو جائے گا بلکہ ایسا آدمی ہر اس شخص پر انتہا پسندی کی تہمت لگائے گا، جو دین کی پابندی کرتا ہے۔ تقویٰ کی لگام سے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں جس سے اسے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام ؟

بہت سے لوگ جو اپنے اسلامی ناموں اور مغربی ذہن کے ساتھ مسلم ملکوں میں رہتے ہیں، تو یہ لوگ اوامر اور نواہی کی پابندی ہی کو دینی انتہاپسندی شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح جن لوگوں نے غیر اسلامی افکار و رسوم کے مقابلہ میں سپر ڈال دی ہے۔ ان کی نگاہ میں ہر وہ شخص جو کھانے پینے میں، رہن سہن میں، لباس و زینت میں اسلامی آداب کی پابندی کرتا ہے دینی انتہاپسندی اور تعصب کے روگ میں مبتلا ہے۔ ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو نوجوان لڑکوں کو داڑھی رکھنے

اور نوجوان لڑکیوں کو پردہ کی پابندی کرنے کو دینی شدت پسندی شمار کرتے ہیں۔

ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو اسلام کی سرزمین میں شریعت کے نفاذ اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت کو دین میں انتہاپسندی شمار کرتے ہیں۔

ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کے نزدیک دینی غیرت انتہاپسندی ہے، جن کے نزدیک بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش، جبکہ وہ مٹ رہی ہوں اور برائیوں سے روکنے کا کام جب کہ ان کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ دین میں انتہاپسندی اور دوسروں کی شخصی آزادی میں مداخلت شمار ہوتی ہے۔

ہم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کے نزدیک غیر مسلموں کو کافر شمار کرنا بھی انتہاپسندی اور تعصب ہے۔ حالانکہ ایمان کی یہ بنیاد ہے کہ مومن اس بات پر یقین رکھے کہ وہ حق پر ہے اور اس کے مخالفین باطل پر ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس میں کسی رواداری کی گنجائش نہیں۔!

دوسری بات

یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ ہم کسی انسان پر انتہاپسندی کا الزام صرف اس لئے لگائیں کہ اس نے اپنے لئے کوئی سخت فقہی رائے اپنالی ہے جبکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ یہی رائے زیادہ صحیح اور درست ہے اور اس کے لئے شرعاً اس کی پابندی ضروری ہے۔ ورنہ آخرت میں اس سے محاسبہ ہوگا۔ اگرچہ دوسروں کی نگاہ میں وہ رائے کمزور ہو، اس لئے کہ جس رائے کو وہ صحیح سمجھتا ہے اور جس پر اسے یقین واعتقاد ہے اسی کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنے اوپر سختی برتتا ہے بلکہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہی رویہ زیادہ افضل

اور پرہیزگاری کی روح سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ فرض اور واجب کے دائرے میں نہیں ہے لیکن وہ اپنے اندر ہمت پاتا ہے اور فرائض کی حدود پر جاکر رک جانا نہیں چاہتا بلکہ آگے بڑھ کر وہ نوافل کے ذریعے بھی قربِ الٰہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر انتہا پسندی کا الزام لگانا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں لوگوں کے رجحان میں فرق پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک آسانی اور نرمی کا رویہ پسندیدہ ہوتا ہے تو کچھ لوگوں کا رجحان سختی اور شدّت پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضؓ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ کا رجحان رخصتوں اور نرمی کی طرف مائل تھا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے اندر شدّت پسندی کا رجحان غالب تھا۔ ایسی حالت میں ایک مسلمان کے لئے یہ کافی ہے کہ جس رائے یا فکر کو وہ اپنا رہا ہے وہ مسلمانوں کے اندر معتبر فقہی گروہوں میں سے کسی گروہ سے ماخوذ ہو۔ یا اس کی بنیاد صحیح اجتہاد اور درست شرعی استدلال پر ہو، مسلمانوں کے اندر جن فقہی مذاہب کی پیروی کی جاتی ہے۔ اگر انہیں اماموں میں سے کسی امام کے نزدیک داڑھی کا بڑھانا واجب ہے اور اس کا منڈانا حرام ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس رائے پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسی پر عمل کرتا ہے تو کیا اس پر انتہا پسندی کا الزام لگایا جا سکتا ہے؟ اس لئے کہ وہ میری یا آپ کی رائے سے اختلاف رکھتا ہے اور معاصرین علماء میں سے زید و عمر کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا، کیا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم دوسروں کا یہ حق ضبط کریں کہ وہ کسی رائے کو کسی رائے پر ترجیح دیں۔ جب کہ اس کا تعلق کسی اور سے نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی اور اپنے رویے سے ہو۔

قدیم اور جدید علماء کی ایک بڑی تعداد یہ رائے رکھتی ہے کہ مسلمان عورت کو اپنا پورا بدن پردے میں رکھنا چاہیئے۔ سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے، کیوں کہ ان لوگوں کے خیال میں آیت کریمہ" وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا " (النور ۳۱) میں جن چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ ان سے مراد یہی چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ ان علماء نے اپنی اس رائے کو احادیث، آثار اور واقعات سے مدلل بھی کیا ہے۔ ہمارے دور کے علماء کی ایک بڑی تعداد نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے، میں بھی انھیں میں ہوں لیکن اسی طرح جلیل القدر علماء کا ایک دوسرا گروہ بھی ہے اور ان کا یہ مسلک ہے کہ چہرہ اور ہتھیلی کا پردہ بھی واجب ہے۔ علماء کے اس گروہ نے اپنی رائے کو نصوص قرآنی، احادیث اور آثار سے مدلل بھی کیا ہے۔ آج کے دور کے علماء کی ایک بڑی تعداد خصوصاً ہندوستان، پاکستان، سعودی عربیہ اور خلیجی ممالک میں اسی دوسرے گروہ کے علماء کی رائے کو صحیح مانتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے۔ ان لوگوں نے مسلم خواتین سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں، نقاب اور دستانہ استعمال کرنے کی اپیل کی ہے تاکہ چہرہ اور ہاتھ چھپا رہے۔

تو کیا جو لڑکی یا خاتون اس فقہی مسلک پر یقین رکھتی ہے اور اسے اپنے دین کا جزء مانتی ہے۔ اس پر انتہا پسندی کا الزام لگا کر اس کا سر پھاڑ ا جائے گا؟ یا اسی طرح اس آدمی کا سر پھاڑا جائے گا جو اپنی بیٹی یا بیوی کو اس مسلک کے اپنانے کی دعوت دیتا ہے اور وہ اسے مان بھی لیتی ہے؟ اور کیا ہمیں یہ حق پہنچتا ہے، کہ ہم اسے یا اُسے مجبور کریں کہ جن چیزوں کو وہ لوگ دین اور شریعت مانتے ہیں، اس سے دستبردار ہوجائیں؟ کیا ہم ان پر یہ پابندی عائد کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری رضا حاصل کرنے اور انتہا پسندی کی تہمت سے بچنے کے لئے جنّت کو بیچ دیں اور جہنّم خرید لیں۔

اسی طرح کی بات ان لوگوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو گانا، موسیقی، فوٹوگرافی اور تصویر بنانے کے سلسلے میں سخت رائے رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان مسائل میں ان کی رائے شخصی طور پر میری رائے اور عصر حاضر کے کچھ مشہور علماء کے اجتہاد کے خلاف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کچھ متقدمین، متاخرین اور معاصرین علماء کی رایوں سے یہ رائے ہم آہنگ بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو ہم انتہا پسند کہتے ہیں اور جن کی بہت سی باتوں پر ہم شدت پسندی یا غلو کا الزام لگاتے ہیں۔ اس کے لئے ہماری فقہ میں اور ہمارے دینی ورثہ میں شرعی بنیاد موجود ہے۔ عصر حاضر کے بعض علماء نے ان رایوں کو پسند کیا ہے۔ اس کے لئے سینہ سپر رہے ہیں اور اسے اپنانے کی دعوت دی ہے۔ کچھ مخلص نوجوانوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا ہے تاکہ اللہ کی رحمتوں کا سایہ نصیب ہو اور عذاب الٰہی سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے چست قمیص اور پتلون کی جگہ پر ڈھیلا ڈھالا لباس اپنا لیا۔ اسے ٹخنوں سے اوپر رکھتے ہیں۔ عورتوں سے مصافحہ کرنے سے بچتے ہیں یا اسی طرح کی اور دوسری باتیں ہیں۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی مسلمان اپنے اوپر سختی کرتا ہے یا کوئی ایسی فقہی رائے اپناتا ہے جو اس کی نگاہ میں رب کو زیادہ راضی کرنے والی، دین کو زیادہ محفوظ رکھنے والی اور آخرت کے لحاظ سے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے تو صرف ان باتوں کی وجہ سے نہ ہم اس کی عیب جوئی کر سکتے ہیں اور نہ اس پر انتہا پسندی کا الزام لگا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اسے اپنی رائے سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کریں یا اس سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ ایسا رویہ اپنائے جو اس کے اعتقاد

کے خلاف ہے۔ہم زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اس کی طرف اسے حکمت سے دعوت دیں۔اس سے اچھی طرح گفتگو کریں۔دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کریں۔اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہماری رائے اسے زیادہ صحیح رائے معلوم ہونے لگے اور ہماری بات اس کی نگاہ میں زیادہ درست بات قرار پائے۔

انتہاپسندی کے مظاہر

۱- انتہاپسندی کیا ہے، انتہاپسندی کے دلائل اور مظاہر کیا ہیں؟

انتہاپسندی کی اولین علامت یہ ہے کہ کسی رائے کے تئیں ایسی طرفداری کی جائے اور ایسی عصبیت برتی جائے کہ دوسروں کی رایوں کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی گنجائش نہ رہ جائے۔یہ وہ فکری جمود ہے جو انسان کو انسانی مصالح، شریعت کے مقاصد اور زمانے کے تقاضوں سے غافل بنا دیتا ہے۔پھر لوگوں سے بات چیت کے لئے دل کے تمام دریچے بند ہو جاتے ہیں اور اس بات کا کوئی موقع نہیں رہتا ہے کہ اپنی رائے کا دوسروں کی رایوں سے موازنہ کیا جائے اور جو بات دلائل کے لحاظ سے زیادہ باوزن معلوم ہو اسے اپنا لیا جائے۔

انتہاپسندی کا بے جا الزام لگانے والوں کے اسلوب فکر کو جس طرح ہم ناپسند کرتے ہیں۔اسی طرح یہ اسلوب بھی ہماری نگاہ میں ناپسندیدہ ہے یہ تو مخالفین کی رائے پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کے مترادف ہے۔

ہاں! ہم سچ مچ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ کوئی شخص مخالفین کی رایوں اور ان کے نقطۂ نظر کو سننے اور سمجھنے سے انکار کر دے اور یہ خیال کرنے لگے کہ وہی تنہا حق پر ہے

دوسرے سب باطل پر ہیں۔ نیز جو بھی اس کی رائے کا ہم نوا نہ ہو، زندگی کے طور و طریق میں اس سے الگ ہو، اس پر جہالت، نفس پرستی، فسق اور معصیت کی تہمت چسپاں کر دے۔ اس نے تو گویا اپنے آپ کو معصوم نبی بنا لیا اور اپنی بات کو وحی کا درجہ دے دیا۔ حالانکہ سلف اور خلف کا اس پر اجماع ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر آدمی کی بات قابلِ قبول بھی ہو سکتی ہے اور قابلِ ترک بھی۔!

پھر یہ کتنی تعجب خیز بات ہے کہ یہ لوگ مشکل سے مشکل مسئلہ اور معاملہ میں اپنے لئے اجتہاد کرنا جائز سمجھتے ہیں اور پھر جو ان کی سمجھ میں آتا ہے چاہے وہ صحیح ہو یا غلط، اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہی اجتہاد کا حق وہ دورِ حاضر کے ان علماء کو دینے کے لئے تیار نہیں، جو اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں۔ ان کے لئے جائز نہیں سمجھتے کہ یہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اجتہاد کر کے کوئی ایسی رائے دیں جو ان کی رائے سے الگ ہو۔

پھر ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے دین کی تعبیر و تشریح میں ایسی رائیں پیش کرتے ہیں جو انتہائی تعجب خیز ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کی رائے سلف و خلف اور معاصرین کی رایوں سے الگ تھلگ ہے۔ یہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ان کا ذہن، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا ذہن ہے اس لئے کہ وہ بھی آدمی تھے اور یہ بھی آدمی ہیں۔ لیکن ان کی یہ بہادری اور شجاعت ہم عصروں کے مقابلے میں پسپا ہو جاتی ہے جو اربابِ علم، ان کی رائے اور اسلوبِ فکر سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں یہ اپنی اس بہادری اور جوانمردی کا اظہار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ "ہم چوں دیگرے نیست" کے روگ ہیں

مبتلا ہیں۔

یہی ناپسندیدہ تعصب، جو اپنی ذات کے علاوہ ہر ایک کی نفی کرتا ہے۔ انتہا پسندی کی صحیح علامت ہے۔ انتہا پسندی وہی ہے جو تم نے کہا ہے۔ دیکھو بات کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ تمہاری ذمہ داری صرف سننا ہے۔ یہ میرا حق ہے کہ میں قیادت کروں۔ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو۔ میری رائے درست ہے۔ اس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ تمہاری رائے غلط ہے۔ اس کے صحیح ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اسلوب فکر کے ساتھ اوروں کے ساتھ مل بیٹھنے کی کبھی بھی کوئی راہ نہیں نکل سکتی ہے۔ اس کے لئے تو میانہ روی چاہئیے لیکن انتہا پسند نہ میانہ روی سے آگاہ ہوتا ہے نہ اسے تسلیم کرتا ہے۔ اس کے اور لوگوں کے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی ہے۔ ایک طرف جتنی قربت اختیار کروگے دوسری طرف سے اتنی ہی دوری بڑھتی جائے گی۔

اس معاملہ کی خطرناکی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ موٹے ڈنڈے کے زور پر اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موٹا ڈنڈا لوہے اور لکڑی کا نہیں، تہمت تراشیوں کا ہوتا ہے۔ یہ اپنے مخالفین پر بدعت، کفر، دین سے فرار اور دینی معاملات میں بے راہ روی کا الزام لگاتے ہیں۔ خدا کی پناہ، اس فکری دہشت پسندی سے۔ یہ کھلی دہشت پسندی سے بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہے۔

غیر ضروری پابندیاں

۲۔ آسانی کی گنجائش ہوتے ہوئے، شدّت پسندی کا رویہ اپنانا اور دوسروں کے لئے اسے لازم قرار دینا، جبکہ اللہ نے اسے لازم نہ قرار دیا ہو دینی

انتہا پسندی کا دوسرا مظہر ہے۔ اس بات میں تو کوئی حرج نہیں ہے کہ بعض مسائل اور حالات میں آدمی اپنے لئے تقویٰ اور احتیاط کے پیش نظر شدّت کا پہلو اپنا لے لیکن اسے دائمی عادت نہیں بنانا چاہیئے کہ آسانیاں اور رخصتیں ضرورتوں اور حالات کے تقاضوں کے باوجود اس کے لئے ناقابلِ قبول ہو کر رہ جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یسروا ولا تعسروا	دین کو آسان بناؤ مشکل نہیں اور لوگوں کو
وبشروا ولا تنفروا	خوش خبری دو متنفر نہ کرو۔

اسی طرح آپؐ کا ایک اور ارشاد ہے:

ان اللہ تعالیٰ یحب ان توئی	بیشک اللہ تعالیٰ رخصتوں پر عمل کرنا پسند کرتا ہے،
رخصتہ کما یکرہ ان توئی معصیتہ	جیسے معصیت کے ارتکاب کو ناپسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ	خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے، سختی
بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۱۸۵)	نہیں چاہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق دیا گیا تو آپ نے ہمیشہ اسی بات کو پسند کیا جس میں آسانی ہو، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

یہ بات تو قابل تسلیم ہے کہ کوئی مسلمان اپنے لئے سخت رویہ اپنائے۔ رخصتوں اور آسانیوں کو چھوڑ کر عزیمت کی راہ پر چلے لیکن جو بات کسی حالت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے وہ عزیمت کو لازم قرار دے دے اور دین میں ان کے لئے تنگی پیدا کر دے اور دنیا بھی ان کے لئے دشوار بنا دے۔ پھر یہ بات

کیوں کر درست ہوسکتی ہے۔ جبکہ اگلی آسمانی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ نمایاں وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے بوجھ اور ان کی بیڑیوں کو اتار دیتے ہیں :

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (الاعراف ۱۵۶)

ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تنہا نماز پڑھتے تھے تو آپ کی نماز سب سے لمبی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ جب آپؐ رات میں تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پاؤں میں ورم آجاتا لیکن جب آپؐ امام ہوتے تو لوگوں کے حالات اور ان کی قوت برداشت کے پیش نظر ہلکی نماز پڑھاتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے :

اذا صلی احدکم بالناس فلیخفف فان فیھم الضعیف والسقیم والکبیر و اذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول مایشاء (البخاری)

جب تم میں سے کوئی امام ہو تو اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہیئے اس لئے مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جب کوئی تنہا نماز پڑھے تو وہ اپنی حسب خواہش اپنی نماز کو طویل کرسکتا ہے۔

حضرت ابومسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا : اے اللہ کے رسولؐ میں صبح کی نماز میں پیچھے رہ جاتا ہوں اس لئے کہ فلاں صاحب بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے

شدید خفگی کا اظہار کیا اور کہا:

یا ایھا الناس ان منکم منفرین فمن ام بالناس فلیتجوز فان خلفہ الضعیف والکبیر وذا الحاجۃ

اے لوگو! تم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو لوگوں کے اندر وحشت اور بیزاری پیدا کر دیتے ہیں پس تم میں سے جو لوگوں کی امامت کرے اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہیئے اس لئے کہ اس کے پیچھے مقتدیوں میں کمزور، بوڑھے اور ضرورتمند بھی ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک بار لمبی نماز پڑھانے پر آپؐ نے معاذؓ سے کہا:

أفتان انت یا معاذ وکررھا ثلاثا

معاذؓ کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو۔ یہ بات آپؐ نے تین بار دھرائی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی لادخل فی الصلوٰۃ وانا ارید اطالتھا فأسمع بکاء الصبی فاتجوز فی صلاتی مما اعلم من شدۃ وجد امہ من بکائہ (البخاری)

میں نماز میں داخل ہوتا ہوں اور اسے لمبی کرنا چاہتا ہوں کہ اتنے میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز کو ہلکی کر دیتا ہوں۔ اس لئے کہ بچے کے رونے سے ماں کے دل میں بے قراری کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اسے میں جانتا ہوں۔

دینی انتہاپسندی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ سنن اور نوافل کے سلسلے میں لوگوں کا اس طرح محاسبہ کیا جائے گویا یہ فرائض ہیں اور مکروہات پر اس طرح باز پرس کی جائے، گویا کہ محرمات ہیں جبکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو لوگوں پر قطعی طور سے فرض نہیں قرار دیا ہے ہم اسے لوگوں پر لازم نہیں قرار دے سکتے۔ فرائض سے جو کچھ زیادہ ہے اس

ہیں لوگوں کو اختیار ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبداللہ کی صحیح روایت میں بادیہ سے آنے والے اعرابی کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ مجھ پر کیا کیا چیزیں فرض ہیں۔ آپ نے کہا: پانچ نمازیں، زکوٰۃ اور رمضان کے روزے تم پر فرض ہیں۔
سائل نے پھر کہا، کیا ان کے علاوہ اور بھی کچھ مجھ پر فرض ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ مگر نفل۔
پھر جاتے ہوئے سائل نے کہا، بخدا میں اس میں کچھ بھی کمی بیشی نہیں کروں گا۔
آپؐ نے اس کی یہ بات سن کر کہا:

افلح ان صدق — اگر اس نے سچ کہا ہے تو فلاح پالی

او — یا

دخل الجنۃ ان صدق — اگر اس نے سچ کہا ہے تو جنتی ہے

میں نے اکثر یہ بات بھی کہی ہے کہ جو مسلمان اس زمانے میں فرائض کو ادا کرتا ہے، کبائر سے بچتا ہے۔ ہم اسے اسلام کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ اسے اسلام کا مددگار سمجھتے ہیں۔ جب تک اللہ اور اس کے رسول سے وہ پرخلوص قلبی لگاؤ رکھتا ہے وہ مسلمان ہے چاہے کچھ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی ہو گئے ہوں۔ اس لئے کہ اس کے پاس روزانہ کی پانچ فرض نمازوں، جمعہ کی نماز اور رمضان کے روزوں وغیرہ کی شکل میں ایسی نیکیاں ہیں جو چھوٹے چھوٹے گناہوں کا کفارہ بن سکتی ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ — درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

(ھود ۱۱۴)

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ

(النساء ۳۱)

اگر تم ان بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے۔

پھر ایسی حالت میں اگر کوئی مسلمان کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کی حلت اور حرمت میں اختلاف ہے اور اللہ کے دین میں اس کی قطعی حرمت ثابت نہیں ہے یا وہ کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جس کے واجب یا سنت ہونے میں اختلاف ہے اور اللہ کی شریعت سے اس کا فرض ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا، تو ایسے مسلمان کو ساقط الاعتبار کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسی لئے میں نے بعض ایسے دینداروں پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جو ہمیشہ شدت پسندی اور سخت گیری کا رویہ اپناتے ہیں اور اختلافی امور میں ان رایوں کو لازم پکڑ لیتے ہیں جن میں زیادہ تنگی، شدت اور دشواری پائی جاتی ہے اور جو نرمی اور کشادگی سے دور ہوتی ہیں۔

پھر یہ لوگ اتنے ہی پر بس نہیں کرتے کہ ان رایوں کو خود اپنا لیں۔ اگرچہ اس سے ان کے لئے بھی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ یہ اسے سارے لوگوں کے لئے لازم قرار دینا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی عالم انتہا پسندی کی اس راہ سے ہٹ کر میانہ روی کی آسان راہ اپنانے کی دعوت دیتا ہے یا شریعت کے احکام و مقاصد کی روشنی میں ایسا فتویٰ دیتا ہے جس میں لوگوں کے لئے زیادہ آسانی ہوتی ہے اور ان کی دشواریاں بھی دور ہو جاتی ہیں، تو یہ لوگ ایسے عالم کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موقع و محل سے اعراض

۳- شدت پسندی اور سخت گیری کے سلسلے میں موقع و محل کو نظر انداز کر دینا

بھی ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً اس رویہ کا اظہار اگر دارالاسلام سے باہر یا نو مسلم قوموں یا حال ہی میں تائب ہونے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، تو اسے مناسب نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ اختلافی امور اور فروعی مسائل میں ان لوگوں کے ساتھ نرمی برتنی چاہئے۔ ان کے سلسلے میں فروعی اور جزئی مسائل کے بجائے پورا زور اصولی اور بنیادی باتوں پر دینا چاہیئے اور سب سے پہلے ان کے عقائد کو درست کرنا چاہیئے۔ پھر جب ان کا دل اسلامی عقائد پر مطمئن ہو جائے تو ارکان اسلام کی دعوت دینی چاہیئے۔ پھر ایمان کے شعبوں اور احسان کے مقامات سے آگاہ کرنا چاہیئے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن بھیجا تو فرمایا:

تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہلِ کتاب ہے۔ انھیں پہلے توحید اور رسالت کی دعوت دینا۔ پھر جب وہ یہ بات مان لیں کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اس کے رسول ہیں تو پھر انھیں یہ بتانا کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر جب وہ اس سلسلہ میں بھی تمہارا کہنا مان لیں تو پھر انھیں یہ بتانا کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ یہ مالداروں سے لی جائے گی اور غریبوں کی طرف لوٹا دی جائے گی۔ (بخاری و مسلم)

غور کیجئے، دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں آنحضرت صلعم نے حضرت معاذ رضؓ کو کس طرح تدریج کا حکم دیا کہ وہ اس کا آغاز بنیاد سے کریں۔ لوگوں کو پہلے اللہ کی توحید اور محمد صلعم کی رسالت کی دعوت دیں اور پھر جب لوگ اس دعوت کو تسلیم کر لیں تو انھیں اسلام کے دوسرے رکن نماز کی طرف بلائیں۔ پھر جب لوگ نماز کے باب میں مطیع ہو جائیں، تو تیسرے رکن زکوٰۃ سے آگاہ کیا جائے...

اسی طرح تدریج سے پورے اسلام سے آگاہ کیا جائے۔

ایک طرف دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں تدریج اور بنیادی باتوں پر توجہ مرکوز کرنے کی یہ تعلیم ہے۔ دوسری طرف جب میں نے بعض مسلم جماعتوں کے چند مخلص نوجوانوں کو امریکہ میں ایک اسلامی مرکز میں بیٹھ کر فروعی مسئلوں پر جھگڑتے دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ یہ لوگ اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ سنیچر اور اتوار کے جلسوں میں مسلمان یہاں کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ چٹائیوں اور فرش پر نہیں بیٹھتے اور نہ اسلامی آداب کے مطابق قبلہ رو ہو کر بیٹھتے ہیں۔ نیز یہ لوگ پتلون پہنتے ہیں، سفید لنگی اور پاجامہ نہیں، فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ شمالی امریکہ میں فکر و عمل کے اس اسلوب نے مجھے زیادہ کبیدہ خاطر کیا اور میں نے ان لوگوں سے کہا، مادّیات کے پیچھے سرپٹ بھاگنے والے اس سماج میں تمہارے لئے اولین اور اہم ترین کام یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرو، انھیں اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ۔ آخرت کے صحیح تصور اور دین کے اعلیٰ اصولوں سے انھیں آگاہ کرو۔ نیز ان تباہ اور ہلاک کرنے والی چیزوں سے انھیں خبردار کرو۔ جن میں آج کا مادی لحاظ سے ترقی یافتہ سماج غرق ہوتا جا رہا ہے۔ اب رہی اعلیٰ اسلامی آداب اور تکمیلی امور کی بات تو ان کی باری ضروری اور بنیادی باتوں کے بعد ہی آتی ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے اسلامی مرکز میں، میں نے دیکھا کہ لوگوں نے زمین و آسمان ایک کر رکھا ہے۔ اس لئے کہ جس کمرے میں یہ لوگ نماز پڑھتے تھے اس میں کوئی تاریخی یا تعلیمی فلم دکھائی گئی تھی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ لوگوں نے مسجد کو سینما کا روپ دے دیا۔ یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی مصالح کے پیش نظر ہی مسجد کی تعمیر ہوتی تھی۔ عہد نبویؐ میں جہاں

اسے دعوت اسلامی اور اسلامی اسٹیٹ کے مرکز ہونے کی حیثیت حاصل تھی وہیں یہ سماجی سرگرمیوں کا محور بھی تھی۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے جو روایت کی ہے اسے فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آنحضرت صلعم نے حبشیوں کو مسجد نبوی میں نیزوں کا کرتب دکھانے کی اجازت دی تھی نیز حضرت عائشہ رض کو اجازت دی تھی کہ پردے سے وہ اس کھیل کو دیکھ لیں۔

سختی اور خشونت

ہدایت ربانی اور طریق نبوی کے برخلاف، معاملات میں سختی، رویہ میں خشونت اور دعوت و تبلیغ کے باب میں ترش کلامی سے کام لینا۔ انتہاپسندی کی علامت ہے اللہ تعالیٰ ہم کو حکم دیتا ہے کہ ہم دعوت الی اللہ کا کام حکمت، دانائی اور نیک نصیحت سے انجام دیں۔ حماقت اور سخت کلامی سے نہیں اور اگر بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو اس وقت بھی بحث و گفتگو کا احسن طریقہ اپنانا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مباحثہ کرو۔ (النحل: ۱۲۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ: ۱۲۸)

دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے۔ جو خود تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے اور تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

باہمی تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خواور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

قرآن پاک نے شدت اور سختی کا ذکر صرف دو موقعوں کے لئے کیا۔

۱۔ عین جنگ کے موقع پر جب دشمن سے مقابلہ ہو، جہاں صحیح عسکری روح سختی کو لازم قرار دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ جذبات میں نرمی نہ آنے پائے تا آنکہ جنگ رک جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً (التوبہ: ۱۲۳)

جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

۲۔ شدت اور سختی کا دوسرا موقع مجرموں پر شرعی سزاؤں کے نفاذ کے وقت ہوتا ہے۔ اللہ کی زمین پر مجرموں کے لئے اللہ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کے موقع پر جذبات رحم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامنگیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ (النور: ۲)

اب رہی بات تبلیغ و دعوت کی تو اس میدان میں سختی اور خشونت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے: "ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ"، اللہ تعالیٰ ہر کام میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"جو بھلائی کا حکم دیتا ہے اس کا معاملہ بھی بھلا ہونا چاہیئے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مادخل الرفق فی شیئ الازانہ	جس چیز میں نرمی برتی جاتی ہے تو نرمی اسے حسین بنا دیتی ہے
ولا دخل العنف فی شیئ الاشانہ	اور جب کسی چیز میں سختی داخل ہو جاتی ہے تو وہ اسے عیب دار کر دیتی ہے۔

شدت اور سختی کا جتنا خراب اثر دعوت اور تبلیغ کے کام پر پڑتا ہے اتنا اور کسی چیز پر نہیں۔ اسلامی دعوت کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اسے خدا پرست انسان بنا دے اور وہ اپنی فکر میں، احساسات میں اور اپنے سلوک و معاملات میں راہِ خدا کا راہی بن جائے۔ وہ اس کے پورے وجود کو فکر وارادہ اور شعور کے لحاظ سے ایک نیا روپ دے دیتی ہے۔ یہی اثرات اس کے جماعتی اور گروہی وجود پر بھی پڑتے ہیں۔ وہ ان کے موروثی عقائد، رسم و رواج، اخلاقی قدروں اور مروجہ تنظیمی ڈھانچوں کو بدل دیتی ہے۔

یہ سارے کام حکمت، دانائی اور حسنِ تدبیر ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کے عناد سے آگاہی ہو، نیز اس کے اندر قدیم اور موروثی چیزوں سے جمود کی حد تک جو گہرا لگاؤ ہوتا ہے وہ بھی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ بحث و مباحثہ ہی نہیں کرتا ہے بلکہ کٹھ حجتی پر بھی اتر آتا ہے۔ ان چیزوں سے آگاہی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کے قلب و ذہن تک پہنچنے کے لئے نرمی کا طریقہ اپنایا جائے۔ یہی رویہ اپنا کر ہم اس کی شدت میں نرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے جمود کو توڑ سکتے ہیں۔

قرآنی بیان کے مطابق دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں انبیاء علیہم کا بھی

مسلک رہا ہے نیز مومنین صادقین میں جو داعی اور مبلّغ ہوئے ہیں ان کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے والد اور اپنی قوم کے سامنے دعوت پیش کی۔ نیز شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم اور موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو ان کی دعوت میں ہم یہی نرمی کا اسلوب پاتے ہیں۔ اسی طرح مومن آل فرعون اور مومن سورۂ یٰسین اور دوسرے داعیان حق کی دعوت میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔

قوم فرعون کے اس بندہ مومن کو دیکھئے۔ یہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو کیسے خطاب کر رہا ہے، انھیں احساس دلاتا ہے کہ آپ سب لوگ میری ہی قوم ہیں۔ میں آپ ہی کی قوم کا ایک فرد ہوں۔ میرے نزدیک آپ ہی کے معاملات کی اہمیت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی حکومت اور آپ کی بزرگی ہمیشہ قائم رہے۔ اسی جذبہ کے تحت وہ ان سے خطاب کرتا ہے:

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ (المؤمن: ۲۹)

اے میری قوم کے لوگو! آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور تم زمین میں غالب ہو۔ لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے۔ جو ہماری مدد کر سکے گا۔

پھر اس خطاب کے بعد وہ انھیں اس انجام سے خبردار کرتا ہے جس سے اگلی قومیں دعوت الٰہی سے اعراض کی پاداش میں دوچار ہو چکی ہیں

يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب کا دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے، جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ (المؤمن: ۳۰، ۳۱)

پھر اس دنیاوی عذاب کے علاوہ وہ انھیں آخرت کے اس عذاب سے بھی ڈراتا ہے جس پر وہ لوگ خود بھی کسی نہ کسی طرح کا ایمان رکھتے تھے۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ

(المومن: ۳۲، ۳۳)

اے قوم مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔

اس مخلص مومن نے اپنی قوم کے سامنے دعوت اسلامی کو پیش کرنے کے لئے جو اسلوب اپنایا۔ اس میں ترغیب و ترہیب کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت کی جھلک ہے۔

يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۚ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ

وہ شخص جو ایمان لایا تھا، بولا، اے میری قوم کے لوگو! میری بات مانو، میں تمھیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔ اے قوم! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے۔ ہمیشہ کے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے۔

(المومن: ۳۸، ۳۹)

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ

(المومن: ۴۱، ۴۲)

اے قوم! آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تم لوگوں کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤں جنھیں میں نہیں جانتا، حالانکہ میں تمھیں اس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔

اور پھر اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس مخلص مومن نے کہا:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔

(المومن: ۴۴)

داعی اور مبلّغ حضرات کو یہی اسلوب اپنا کر مخالفوں کے سامنے دعوت پیش کرنا چاہیئے اور اسی اسلوب میں ان سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دو بزرگ رسولوں، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جو نصیحت کی ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ (طٰہٰ: ۴۳، ۴۴)

اسی لئے جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس پہنچے تو نہایت نرمی سے اس کے سامنے دعوت اسلامی کو پیش کیا:

هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ (النازعات: ۱۸، ۱۹)

کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ خود کو پاکیزگی سے بہرہ مند کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں۔ تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو۔

ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ سوجھ بوجھ رکھنے والے مبلّغ اور داعی کچھ مخلص نوجوانوں کے اس طریق کار کی مخالفت کرتے ہیں جسے یہ لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کے موقع پر اپناتے ہیں۔ ان کے رویہ اور اسلوب میں شدّت اور سختی کا غلبہ ہوتا ہے، اسی سے یہ فکری مخالفت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بحث و مباحثہ میں احسن طریقہ اپنانے کے بجائے شدت اور ترش روئی کا راستہ اپناتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ لوگ چھوٹے اور بڑے کا کوئی لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ یہ سب کے ساتھ ایک ہی برتاؤ کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ کون ان کے باپ کی طرح خصوصی احترام کا مستحق ہے اور کون نہیں؟ اور نہ اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ کون عالم، استاذ اور مربی ہونے کی حیثیت سے خصوصی توقیر و احترام کا مستحق ہے اور کون نہیں۔ ان کے نزدیک دینی خدمات میں پہل کرنے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں میں کوئی فرق

نہیں ہوتا۔ نیز عوام، ان پڑھ اور روزی روٹی میں مشغول افراد جن کے پاس کسی نہ کسی حد تک کوئی عذر ہوتا ہے یا جن لوگوں کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا نیز اسلام کے تئیں عناد کا رویہ رکھتے ہیں۔ اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ بن کر اسلام کی مخالفت کرتے ہیں اور جان بوجھ کر جہنم کے شعلوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان دونوں گروہوں میں بھی کوئی فرق نہیں کرتے۔ اللہ کی رحمت ہو محدثین پر کہ ان بزرگوں نے عام بدعتیوں میں اور ان لوگوں میں جو بدعت کے مبلغ ہوتے ہیں اور اسے رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فرق کیا ہے۔ پہلے گروہ کی روایت کو وہ قبول کرتے ہیں لیکن دوسرے گروہ کی روایت ان کے نزدیک ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔

بدگمانی

بدگمانی بھی انتہاپسندی کی علامت ہے، دوسروں کے تئیں بدگمانی کا رویہ اپنانا، انھیں ایسی سیاہ عینک سے دیکھنا جو ان کی اچھائیوں کو چھپا دے اور ان کی برائیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھائے، انتہاپسندی کے لوازمات میں ہے۔

انتہاپسند کے نزدیک۔ بدگمانی اور تہمت۔ اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ شریعت اور قانون کی نگاہ میں ہر شخص بے قصور ہے جب تک کہ اس کا کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے۔

آپ دیکھیں گے کہ انتہاپسند اور غلو کرنے والے حضرات معمولی معمولی باتوں پر بہت جلد بدگمان ہو جاتے ہیں اور تہمت تراشی پر اتر آتے ہیں، دوسروں کے تئیں عذر تلاش کرنے کے بجائے ان کے عیوب کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ غلطیوں کا انبار جمع کرتے ہیں پھر ڈھول پیٹ پیٹ کر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ لغزشوں کو گناہ شمار کرتے

ہیں اور پھر اسے کفر بنا دیتے ہیں اور اگر کوئی ایسی بات یا کام ہو جس میں خیر اور شر دونوں پہلو کا احتمال ہو، ایک پہلو اس میں خیر اور ہدایت کا ہو اور دوسرے رخ سے اس میں برائی اور گمراہی کا احتمال ہو تو یہ لوگ گمراہی کے احتمال کو بھلائی کے احتمال پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ اکابر علمائے امت سے جو بات منقول ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اقوال و اعمال اور تصرفات کو باطل قرار دینے کے بجائے حتی الامکان بھلائی پر محمول کرنا چاہیئے۔

بعض اسلاف کہا کرتے تھے: میں اپنے بھائی کے لئے ستر عذر تلاش کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں، ہو سکتا ہے کوئی اور عذر بھی ہو جسے میں نہ جانتا ہوں، لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نقطہ نظر کے مطابق ان کی کسی رائے یا رویّہ سے اختلاف کرتا ہے تو اسے گنہ گار، بدعتی اور مخالف سنت قرار دیتے ہیں اور طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے ہیں۔

اگر تم ڈنڈا لے کر چلنے اور زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے سلسلے میں ان کی رائے سے اختلاف کرو گے تو وہ تم پر اتہام لگائیں گے کہ تم سنت کا احترام نہیں کرتے ہو یا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) سے محبت نہیں رکھتے ہو۔

ان کی یہ بدگمانیاں صرف عام لوگوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ خاص لوگ بھی اس کی زد میں آتے رہتے ہیں۔ کوئی عالم، کوئی مبلغ اور کوئی مفکر ان کی تہمت تراشیوں کے باد سموم سے محفوظ نہیں رہتا۔

اگر کوئی فقیہہ ایسا فتویٰ دے دے جس میں اللہ کی مخلوق کے لئے آسانی ہو اور دشواریاں دور ہوتی ہوں تو وہ فقیہہ ان کی نگاہ میں دین کے وقار کو مجروح کرنے والا ہے۔

اگر کوئی مبلغ عصری ذوق اور اسلوب کو سامنے رکھ کر دعوت اسلامی کو پیش کرتا ہے تو وہ ان کی نگاہ میں ذہنی اعتبار سے شکست خوردہ ہے۔ اس نے مغرب اور مغربی تہذیب کے سامنے سپر ڈال دی ہے۔ یہ تہمت تراشیاں، صرف زندہ افراد ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی زد میں وہ افراد بھی آتے ہیں، جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور آج اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید نہیں کر سکتے، تمام گزری ہوئی نمایاں شخصیتیں ان کی تہمت تراشیوں کے ترکش کا نشانہ بنتی رہتی ہیں، یہ ماسونی ہے، وہ جہمی ہے اور فلاں معتزلی ہے! یہاں تک کہ وہ بڑے بڑے امام جن کے مسلک کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کی بزرگی اور عظمت امت مسلمہ کے اندر ہر دَور میں مسلّم رہی ہے۔ وہ بھی ان کی زبانوں اور بدگمانیوں سے محفوظ نہ رہ سکے، بلکہ امت کی پوری تاریخ، اپنے علم وفن اور تہذیب وتمدن کے ساتھ، عصر حاضر ہی کی طرح ان کے تیروں کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ ان میں سے اگر ایک گروہ کے نزدیک امت کی پوری تاریخ اقتدار کے لئے فتنوں اور کشمکش کی تاریخ ہے تو دوسروں کے نزدیک یہ تاریخ کفر اور جاہلیت کی تاریخ ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض لوگوں نے یہ تصور بھی دیا کہ پوری امت چوتھی صدی ہجری کے بعد راہ کفر کی راہی بن گئی تھی۔

غالباً انھیں کے اسلاف میں سے کسی نے ایک بار سید البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر کہا تھا: اس تقسیم میں اللہ کی رضا مطلوب نہیں رہی ہے، اے محمدؐ تقسیم میں انصاف برتئے. آپؐ نے انصاف سے کام نہیں لیا۔

یہ وہ گروہ ہے جو تعمیر نہیں تخریب کا رسیا رہا ہے۔ دوسروں پر تنقید کرنا

اور اپنے آپ کو عیوب سے پاک وصاف گردانناان کا معروف شیوہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ (النجم: ۳۲)

(پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے۔)

اس گروہ کی یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ بدگمانی ان کے دل ودماغ کے ریشہ ریشہ میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ لوگ اگر قرآن اور سنت کی طرف رجوع کرتے تو انھیں وہ چیز مل جاتی، جس سے ایک مسلمان کے دل میں بندگان خدا کے تئیں حسن ظن پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی عیب پر اس کی نگاہ پڑتی تو وہ اس کی پردہ پوشی کرتا، تاکہ اللہ بھی دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے اور اگر اس کی نگاہ کسی اچھائی پر پڑتی تو اسے وہ ظاہر کرتا اور پھیلاتا اور اگر کسی مسلمان کے اندر اسے کوئی خرابی نظر آجاتی، تو اس ایک برائی کے باعث وہ اس کی دوسری جانی اور انجانی بھلائیوں کو فراموش نہیں کردیتا۔

بیشک اسلام کی تعلیم نے دو عادتوں۔ اللہ کے ساتھ اور لوگوں کے ساتھ بدگمانی کرنے سے بڑی شدت کے ساتھ خبردار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ (الحجرات: ۱۲)

ارشاد رسولؐ ہے:

ایاکم والظن، فان الظن اکذب الحدیث

اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ، بیشک بدگمانی بڑی جھوٹی بات ہے (متفق علیہ)

فریب نفس میں مبتلا ہونا، دوسروں کو حقیر سمجھنا، بدگمانی کی جڑ ہے۔

اس دنیا میں سب سے پہلے اللہ کی نافرمانی کے لئے یہی چیز بنیاد بنی یہی فریب نفس اور تکبر ابلیس کی نافرمانی کی بنیاد بھی ہے۔ اسی کا اظہار اس نے "انا خیر منہ" "میں آدم سے بہتر ہوں" کہہ کر کیا تھا۔

بدگمانی کے رویہ سے باز رکھنے کے لئے یہ صحیح حدیث نبوی ہمارے لئے کافی ہے،

اذا سمعتم رجلا یقول ھلك الناس، فھو اھلکم

جب تم کسی آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ "لوگ ہلاک ہو گئے" تو گویا اس نے سب کو ہلاک کر دیا۔

یہ روایت کاف پر زبر کے ساتھ آئی ہے "فَھُوَ اَھْلَکَھُمْ" ایسی حالت میں اھلك فعل ماضی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے انھیں اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیا اور اپنے کبر اور بدگمانی کے باعث ان کی ہلاکت کا سبب بن گیا۔

اسی طرح اَھْلَکُھُمْ کو کاف کے پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور ایسی صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا، وہ شخص خود ہی اپنی خود پسندی اور فریب نفس میں مبتلا ہونے نیز دوسروں کو متہم گردانے کے باعث سب سے پہلے ہلاک ہونے والوں میں ہوگا۔ خود پسندی کا شمار ان چیزوں میں ہوتا ہے جو انسان کے اخلاق کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں اسی لئے ہمارے علماء نے اسے معاصی القلوب کہا ہے جس سے حدیث نبوی میں خبردار کیا گیا ہے:

تین چیزیں، بڑھا ہوا لالچ، خواہش نفس کی پیروی اور آدمی کی خود پسندی، ہلاک کرنے والی ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ مسلمان کبھی بھی اپنے عمل سے دھوکہ میں نہیں پڑتا۔ وہ ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ انجانے میں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو قبول عمل کی راہ میں روک بن جائے۔ قرآن نے اہلِ ایمان کے بارے میں کہا کہ وہ بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ

اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ (المؤمنون: ۶۰)

حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے جن کے اعمال اچھے ہیں لیکن اندیشہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ شاید بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہ ہوں نیز حکم ابن عطاء سے مروی ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ تمہارے لیئے اطاعت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولتا اور بسا اوقات تمہارے لیئے معصیت مقدر ہوجاتی ہے اور وہ قرب کا سبب بن جاتی ہے اس لئے کہ ایسی معصیت جس سے دل شکستگی اور احساس ذلت پیدا ہو اس طاعت سے بہتر ہے جو انسان کو خود پسندی اور تکبر کے روگ میں مبتلا کردیتی ہے۔

اس صداقت کی بنیاد حضرت علیؓ کا یہ پُر حکمت ارشاد ہے:

"وہ برائی جو تمہیں ناگوار گزرتی ہے۔ اللہ کے نزدیک اس بھلائی سے زیادہ اچھی ہے جو تمہیں خود پسند بنا دیتی ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

"خود پسندی اور مایوسی، ان دونوں چیزوں میں ہلاکت اور بربادی ہے اس لئے کہ سعادت کا حصول سعی اور طلب پر موقوف ہے لیکن خود پسند یہ خیال کرکے کوشش سے باز رہتا ہے کہ سعادت سے تو وہ ہم کنار ہے اور مایوس انسان اس لئے تگ و دو سے الگ تھلگ رہتا ہے کہ اس کی نگاہ میں اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔"

تکفیر کی کھائی

یہ انتہا پسندی اس وقت اپنی آخری حد پر پہنچ

جاتی ہے۔ جب یہ دوسروں کو خطا کار مان کر ان کی جان و مال کو مباح قرار دے دیتی ہے۔ اس کی نگاہ میں دوسروں کے لئے نہ کوئی حرمت ہوتی ہے نہ کوئی لحاظ، اس کیفیت کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب یہ تکفیر کا سیلاب برپا کرتے ہیں اور عام لوگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ تو اسلام سے نکل گئے ہیں، یا اسلام میں سچے دل سے داخل ہی نہیں ہوئے، جیسا کہ ان میں سے بعض لوگوں کا کہنا ہے۔ یہ انتہا پسندی کی وہ بلند ترین چوٹی ہے جو انتہا پسندوں کو ساری امت سے الگ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ ایک وادی میں ہوتے اور پوری امت دوسری وادی میں۔

اسی انتہا پسندی کے روگ میں پہلے خوارج مبتلا ہوئے، یہ لوگ عبادات میں صیام و قیام اور تلاوت قرآن میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی تھے۔ ان کا یہ روگ ضمیر کے فساد کا نہیں فکری انحراف کا نتیجہ تھا۔

ان کے برے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین بنا دیئے گئے تھے۔ دنیا کی ساری تگ و دو ان کی اکارت چلی گئی اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ اچھا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ ان ہی لوگوں کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تم میں سے ہر کوئی اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنے قیام لیل کو ان کے قیام لیل کے مقابلہ میں اور اپنی تلاوت قرآن کو ان کی تلاوت قرآن کے مقابلہ میں حقیر سمجھے گا۔"

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپؐ نے ان کے بارے میں فرمایا:

"یہ لوگ دین سے ویسے ہی نکل گئے ہیں جیسے تیر کمان سے نکل کر دور چلا جاتا ہے۔" پھر قرآن پاک سے ان کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

"یہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن یہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا"

پھران کانمایاں وصف بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

"یہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور مشرکوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتے ہیں اور انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

ایک بار ایک عالم دین کو ان خوارج نے پکڑ لیا اور پھر اس سے پوچھا:

"تم کون ہو" تو اس عالم نے ان کے اسی نمایاں وصف کے پیش نظر کہا،

"پناہ کا طلب گار مشرک، کلام اللہ سننا چاہتا ہے۔"

عالم کی یہ بات سن کر خوارج نے کہا: آپ کو پناہ دینا ہمارے اوپر لازم ہے۔ ہم آپ کو آپ کے گھر تک پہنچائیں گے۔ پھر ان لوگوں نے یہ آیت پڑھی۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ

اور اگر مشرکین میں سے کوئی پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ کلام اللہ سنے) تو اسے پناہ دے دو تاکہ وہ کلام اللہ سن لے، پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ (التوبہ: ۶)

مختصر یہ کہ وہ عالم مشرک مستجیر بن کر بچ گیا لیکن اگر وہ ان کے سوال کے جواب میں یہ کہتا کہ میں مسلمان ہوں تو یہ خوارج اس کا سر قلم کر دیتے۔

جس روگ میں پہلے خوارج کا ایک گروہ مبتلا ہوا تھا، اسی روگ میں آج ان کے اخلاف مبتلا ہیں۔ اس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا نام 'جماعۃ التکفیر والہجرہ' رکھا ہے۔

یہ لوگ ہر اس شخص کی تکفیر کرتے ہیں، جس نے ان کے خیال میں کسی معصیت کا ارتکاب کیا اور اس پر مصر رہا اور تائب نہ ہوا۔

یہ لوگ: حاکموں کی بھی تکفیر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔

یہ لوگ : رعایا کی بھی تکفیر کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ اپنے حاکموں سے راضی ہیں اور ان کے غیر شرعی فیصلوں میں ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

یہ لوگ: علمائے دین اور دوسرے لوگوں کی بھی تکفیر کرتے ہیں، اس لئے کہ ان لوگوں نے حاکموں اور ان کی اطاعت کرنے والی رعایا کی تکفیر نہیں کی اور جو کافر کی تکفیر نہ کرے وہ خود کافر ہے۔

یہ لوگ: ہر اس شخص کی تکفیر کرتے ہیں جس کے سامنے اپنے افکار کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن نہ وہ اسے قبول کرتا ہے اور نہ ان کے مسلک میں داخل ہوتا ہے۔

یہ لوگ: ہر اس شخص کی تکفیر کرتے ہیں جو ان کی رائے کو تو تسلیم کر لیتا ہے لیکن نہ ان کی جماعت میں داخل ہوتا ہے نہ ان کے امام سے بیعت کرتا ہے۔

اور جو شخص ان کے امام سے بیعت کر لیتا ہے، ان کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے لیکن پھر اس کی رائے بدل جاتی ہے اور کسی نہ کسی سبب سے جماعت کو چھوڑ دیتا ہے تو ان لوگوں کی نگاہ میں وہ مرتد قرار پاتا ہے اور اس کا خون مباح ہو جاتا ہے۔

اور اس طرح وہ تمام دوسری اسلامی جماعتیں جن تک ان کی دعوت پہنچ گئی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو تحلیل کر کے ان کے امام سے بیعت نہیں کرتی ہیں تو وہ بے دین اور کافر ہیں۔

اور اسی طرح ہر وہ شخص جو اماموں کے اقوال یا اجماع یا قیاس، یا عمومی مصالح یا استحسان کو دین کے باب میں حجت اور سند مانتا ہے وہ ان کے نزدیک مشرک اور کافر ہے۔

ان کی نگاہ میں چوتھی صدی ہجری کے بعد پورا اسلامی دور کفر اور جاہلیت کا دور

ہے۔ اس لئے کہ یہ پورا دور خدا کے علاوہ الٰہ تقلید کے صنم کی تقدیس کا دور ہے[1]۔ اس طرح ان لوگوں نے تکفیر کے سلسلے میں اسراف کا رویہ اپنایا۔ زندہ اور مردہ تمام لوگوں کو کافر بنایا۔ حالانکہ مسلمان کی تکفیر کا معاملہ انتہائی خطرناک معاملہ ہے۔ اسی کی بنیاد پر اس کی جان و مال حلال ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے اس سے جدا ہو جاتے ہیں مسلمانوں سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں سے اس کی وراثت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے نہ وہ کسی مسلمان کا وارث ہوگا نہ کوئی مسلمان اس کا وارث ہوگا اور جب وہ مر جائے گا تو اسے غسل اور کفن بھی نہیں دیا جائے گا، نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوگا۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر کفر کی تہمت لگانے سے بڑی شدت کے ساتھ خبردار کیا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی کو اے کافر کہہ کر پکارا تو یہ تہمت دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آئے گی جسے کافر کہا گیا ہے اگر یقینی طور پر وہ کافر نہیں ہے تو یہ تہمت کہنے والے پر لوٹ آئے گی اور اسی پر چسپاں ہو کر رہ جائے گی اور یہ کتنی خطرناک بات ہے۔؟

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے واقعہ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ جس نے لاالٰہ الا اللہ کہا وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو گیا اور اگر اس نے اس کلمہ کا اقرار خوف کے باعث یا جان بچانے کے لئے کیا ہے تو اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ انسان صرف ظاہر ہی پر حکم لگا سکتا ہے۔ دلوں کے اندر کیا ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے اسی لئے جب حضرت اسامہؓ نے لاالٰہ الا اللہ کہنے کے باوجود میدانِ جنگ میں ایک شخص کو قتل کر دیا، تو آپؐ نے بڑی شدت سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، آپؐ نے فرمایا: لاالٰہ الا اللہ کہنے کے بعد تم نے

---

[1] ذکریاتی مع جماعۃ المسلمین ۔ التکفیر والہجرہ ۔ عبدالرحمٰن ابوالخیر)

اسے قتل کر دیا؟ حضرت اسامہؓ نے کہا، اس نے تو صرف تلوار کے خوف سے لاالٰہ الااللہ کہا تھا، آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ قیامت کے دن اس کلمہ کے لئے تمہارے پاس کیا جواب ہوگا، حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپ اس جملے کو برابر دہراتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں نے آج ہی اسلام قبول کیا ہوتا!

جو شخص اسلام میں یقین کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ کسی شبہ کی بنیاد پر اسلام سے اس کا اخراج درست اور جائز نہیں ہو سکتا۔ اس اخراج کے لئے اسی طرح کے یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ معصیت مسلمان کو اسلام سے خارج نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ گناہ کبیرہ مثلاً قتل، زنا، شراب نوشی سے بھی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا الا یہ کہ ان کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ شرعی احکام کا وہ انکار کر دے۔ اسی لئے قرآن پاک نے قاتل عمد اور مقتول کے ولی کے درمیان دینی رشتہ اخوت کا اثبات کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ

ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیئے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خونبہا ادا کر دے۔ (البقرہ: ۱۷۸)

اسی طرح ایک شخص پر کئی بار شراب کی حد جاری کی گئی۔ اس پر کسی نے لعنت کی تو آپؐ نے فرمایا: لاتلعنه فانه یحب الله ورسوله (اس پر لعنت نہ بھیجو وہ اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت رکھتا ہے)

شریعت میں قتل، زنا اور شراب نوشی کی سزا الگ الگ مقرر کی گئی۔ اگر یہ سارے گناہ کفر ہوتے تو سب پر مرتد کی سزا کا نفاذ ہوتا۔ غالی اور انتہا پسند حضرات جن شبہات و شکوک کو تکفیر کے لئے آڑ بناتے ہیں قرآن و سنت کے محکم اور روشن دلائل نے ان سب کو رد کر دیا ہے۔ صدیوں سے امت کا دامن اس فکری اسلوب سے پاک و صاف ہے لیکن۔ اب یہ لوگ۔ از سر نو اس فکری کجروی کی تجدید کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس امت اسلامیہ کو اس کی بے راہ روی سے کیا واسطہ۔؟

فصل دوم

انتہا پسندی کے اسباب

گزشتہ صفحات میں دینی انتہا پسندی اور اس کی علامتوں اور نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ انتہا پسندی بغیر سبب کے یوں ہی نہیں پیدا ہو گئی اس کے پیچھے کچھ اسباب اور محرکات ہیں۔ اس عالم آب و گل میں کوئی چیز بغیر سبب کے نہیں ہوتی اور نہ کوئی پودا بغیر بیج کے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کے لئے کچھ اسباب ہوتے ہیں، کوئی مسبب، سبب کے بغیر پیدا نہیں ہوتا اللہ کا یہی قانون اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔

ایسی حالت میں سبب کا جاننا بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس سے صرف یہی نہیں کہ حیرت کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر علاج کی نوعیت متعین ہوتی ہے اور دوا تجویز کی جاتی ہے۔ نہ بغیر تشخیص کے علاج ممکن ہوتا ہے اور نہ بغیر اسباب جانے مرض کی صحیح تشخیص ہوتی ہے۔

اور اب اس موڑ پر ہم بھی لوگوں کے ساتھ یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا اسباب و محرکات ہیں جنھوں نے دین میں انتہا پسندی اور غلو کو اس منزل پر پہنچایا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس انتہا پسندی کا کوئی ایک سبب نہیں ہے بلکہ متعدد اور نوع بہ نوع اسباب ہیں اور یہ انصاف پسندی نہیں ہوگی کہ ہم صرف ایک سبب پر

نگاہیں مرکوز کردیں اور دوسرے اسباب سے چشم پوشی کریں جیساکہ کسی متعین فکری گروہ کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔

نفسیاتی مکتبہ فکر سے وابستہ حضرات ہر چیز کا سبب نفسیاتی اسباب کو بتاتے ہیں ان کے نزدیک یہ اسباب لاشعور اور باطن میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح سماجی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں کی نظر میں سماج اور اس کے حالات اور اس کے عادات و رسوم ہی ہر چیز پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کی نگاہ میں آدمی کی حیثیت ایک گڑیا یا کٹھ پتلی کی ہوتی ہے جسے سماج بقول "دورکاہم" حرکت دیتا رہتا ہے۔ خالص مادی نقطہ نظر رکھنے والے مادی اور اقتصادی اسباب کے علاوہ کسی اور سبب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی نگاہ میں ہر حادثہ کے پیچھے یہی اسباب ہوتے ہیں اور یہی تاریخ کے دھارے کو موڑتے ہیں۔

لیکن جن لوگوں کی نظر میں وسعت اور توازن ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہاں بہت سے اسباب اور عوامل آپس میں گڈمڈ اور ملے جلے اور سرگرم عمل ہیں۔ ہر ایک کا الگ الگ اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ایک سبب کا اگر ایک شخص پر زیادہ اثر پڑتا ہے تو دوسرے کے لئے اس کی تاثیر کم ہو کر رہ جاتی ہے لیکن تمام اسباب و عوامل اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ان کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی حالت میں ہمیں ایک ہی سبب پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرنی چاہیئے۔ جبکہ یہاں بہت سے اسباب اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جو حالات ہیں وہ پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے اسباب بھی بہت اور نوع بہ نوع ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ بعض اسباب نزدیکی ہیں تو بعض دور کے، کچھ براہ راست اثر انداز ہو رہے ہیں تو کچھ بالواسطہ۔ کچھ اسباب سطح پر ابھرے ہوئے ہیں۔

آنکھوں سے نظر آتے ہیں تو کچھ انتہائی گہرائی میں ہوتے ہیں اور انھیں بصارت سے نہیں بصیرت سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ان اسباب میں کچھ دینی ہیں، کچھ سیاسی ہیں، کچھ سماجی اور اقتصادی ہیں، کچھ نفسیاتی اور نظریاتی ہیں اور کچھ اسباب ایسے بھی ہیں جنھیں ان سب کا یا بعض کا مرکب قرار دیا جا سکتا ہے۔

پھر انتہاپسندی کا سبب اوّل جہاں انتہاپسند شخصیت کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہیں غور و فکر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب، خاندان کے اندر افراد کے باہمی تعلقات میں، نیز ماں باپ اور بھائیوں سے اس کے تعلقات میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اور کبھی کبھی غور و فکر اور جائزہ سے یہ بات سامنے آجاتی کہ انتہاپسندی کا یہ سبب سماج کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ عقیدہ اور رویہ میں، فرائض اور عملی زندگی میں، دین اور سیاست میں، قول اور عمل میں، آرزوؤں اور کامیابیوں میں اللہ کی نازل کردہ شریعت میں اور انسان کے بنائے ہوئے قانون میں، سماج کے اندر جو تضاد پایا جاتا ہے، وہی انتہاپسندی کا سبب ہے۔

اس طرح کے تضاد اور تناقض کو اگر بزرگ برداشت بھی کرلیں، تو نوجوان برداشت نہیں کر سکتے اور اگر بعض نوجوان برداشت بھی کرلیں تو سارے نوجوان اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اگر تھوڑے وقفہ کے لئے اسے سارے نوجوان برداشت بھی کرلیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برداشت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

اور کبھی کبھی حکومت کی خرابی اور بگاڑ، انتہاپسندی کے لئے سبب بن جاتا ہے حکام کی زیادتی، خواہشات کے پیچھے ان کا دوڑنا، قوم کے حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی

برتنا۔ اندرون ملک بڑے حاشیہ نشینوں کی خواہشات کی پیروی کرنا، اسلام دشمن بیرونی طاقتوں کے اشارہ پر چلنا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کے باعث قرآن اور اقتدار، دین اور حکومت دو ایسے متوازی خطوں میں منقسم ہو گئے ہیں جو آپس میں مل نہیں سکتے۔

بیشک دینی بے بصیرتی، فہم دین، حکمت دین اور مقاصد دین کے سلسلے میں بے بضاعتی اور روح دین سے دوری، انتہا پسندی اور غلو کے بنیادی اسباب میں ہیں۔ لیکن اس سے میری مراد، دین سے مکمل بے خبری نہیں۔ مکمل بے خبری اور جہل مطلق سے انتہا پسندی اور غلو کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے اخلاقی گراوٹ اور شریعت سے آزادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے دینی بے بصیرتی اور بے بضاعتی سے میری مراد وہ کم علم لوگ ہیں جو ناقص علم کے باوجود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی علماء کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ حالانکہ دین کی بہت سی باتوں کو وہ جانتے ہی نہیں اور جو کچھ جانتے ہیں وہ یہاں وہاں کی کچھ سطحی اور غیر مربوط باتیں ہوتی ہیں۔ ان کے علم میں کوئی گہرائی نہیں۔ نہ یہ جزئیات کو کلیات سے مربوط کر پاتے ہیں۔ نہ تعارض اور ترجیح کے فن سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ متشابہات اور ظنیات کو محکمات اور قطعیات کی روشنی میں سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں — اللہ کی رحمت ہو، امام ابو اسحٰق شاطبیؒ پر جنھوں نے اپنی کتاب الاعتصام میں اس خرابی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " وہ مذموم اختلاف جو امت مسلمہ کو الگ الگ گروہوں میں بانٹ دیتا ہے اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع کر دیتا ہے۔ اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب کوئی آدمی اپنے بارے میں خیال کرنے لگتا ہے یا لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ عالم اور مجتہد ہے حالانکہ اسے وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا اور پھر اسی کے مطابق وہ عمل بھی کرنے لگتا ہے، اپنی رائے کو اہمیت اور اپنے اختلاف کو وزن دینے لگتا ہے۔ پھر یہ اختلافات کبھی دین کے جزئی اور فروعی مسائل میں ہوتے ہیں اور کبھی اصولی اور کلی امور میں ہوتے ہیں، پھر

تم دیکھو گے کہ یہ شریعت کی بعض جزئیات کو لے کر کلیات کو ڈھا دیتے ہیں اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نہ فہم دین میں راسخ ہوتے ہیں نہ مقاصد شریعت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ صحیح معنوں میں دین میں بدعت کو فروغ دینے والے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے سلسلے میں ایک حدیث میں خبردار کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یقبض اللہ العلم انتزاعاً ینتزعہ من الناس ولکن یقبض العلماء حتیٰ اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤساء جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا (بخاری، مسلم)

اللہ تعالیٰ لوگوں سے چھین کر علم کو نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھا کر علم اٹھالیا جائے گا۔ پھر جب کوئی حقیقی عالم نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور پھر ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرینگے۔

بعض اہل علم کے نزدیک اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ لوگوں پر دشواریاں علماء کی طرف سے نہیں آئیں گی بلکہ ان لوگوں کی طرف سے آئیں گی جو علم کے بغیر فتویٰ دیں گے یہی لوگ عوام کے لئے مصیبت بنیں گے، اسی سے ملتی جلتی بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ امین نے کبھی خیانت نہیں کی لیکن جب غیر امین کو امین بنایا گیا تو اس نے خیانت کی اور اب ہم کہتے ہیں کہ عالم نے کبھی بھی دین میں بدعت کو در آنے کا موقع نہیں دیا۔ یہ تو ان لوگوں کا کارنامہ ہے جن لوگوں نے علم کے بغیر فتویٰ دیا۔

حضرت مالک بن انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن ربیعہؒ بہت زیادہ رو رہے تھے ان سے پوچھا گیا، کیا آپ کسی مصیبت سے دوچار ہو گئے ہیں۔ فرمایا، نہیں۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اب دینی مسائل ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جن کے پاس کوئی

علم نہیں ہے! حقیقت بھی یہی ہے کہ جب ناقص اور ادھورے علم کے ساتھ خود پسندی اور فریب نفس بھی شامل ہو جائے تو وہ اس جہل مطلق سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے جس میں جہل کا اعتراف بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جہالت سادہ ہے اور وہ جہل مرکب ہے۔ اس کا ظہور اس آدمی کی طرف سے ہوتا ہے جو کچھ نہیں جانتا اور اسے اپنے جہل کا بھی علم نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اپنے جہل کا اظہار، علم کے روپ میں طرح طرح سے کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی کچھ اہم باتوں کا ذکر کریں گے۔

ظاہریت

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس گروہ کے بہت سے افراد نصوص کے حقیقی مفہوم اور مقاصد سے صرف نظر کر کے ظاہری اور لفظی مفہوم سے استدلال کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ ظاہری مکتبہ فکر کی تجدید میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ امت اس سے کب کی فارغ ہو چکی ہے۔ یہ وہ فکری گروہ ہے جو احکام کی علت کو تسلیم نہیں کرتا اور اسی لئے قیاس کا بھی انکار کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں شریعت دو مماثل چیزوں میں فرق کر دیتی ہے اور دو مختلف چیزوں کو ایک حکم کے تحت جمع کر دیتی ہے۔

یہ جدید ظاہریت۔ قدیم ظاہریت کی پیروی کرتے ہوئے احکام کے علل اور مقاصد و مصالح سے صرف نظر کر کے، عبادات اور عادات و معاملات کو ایک ہی لڑی میں پرونے کی کوشش کرتی ہے۔ ان ظاہریوں کے نزدیک ہر حکم کو ثواب کے لئے تعبدی طور پر تسلیم کرنا چاہئیے اور اطاعت کرنی چاہئیے۔ کسی حکم کے سلسلے میں یہ نہیں دیکھنا چاہئیے کہ اس کی علت اور سبب کیا ہے یا اس کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ ان نئے اور پرانے ظاہریوں میں یہ فرق ہے کہ قدیم ظاہریوں نے صراحت کے ساتھ اپنے مسلک کا اعلان کیا تھا اور پوری طاقت

سے اس کی مدافعت کی اور غلطیوں سے بچتے ہوئے اس کی پابندی بھی کی لیکن یہ نئے ظاہری، قدیم ظاہریت کی مکمل پیروی نہیں کرتے، یہ تو صرف احکام کے علل و مقاصد اور حکم اور اسرار کا انکار کر کے اس کے سلبی پہلو کی اتباع کرتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں میں محققین علماء کے ساتھ ہوں کہ عبادات کا معاملہ تعبدی ہے اس میں اصل اطاعت ہے، مقاصد اور مصالح پر نگاہ ڈالے بغیر، لیکن عادات اور معاملات کی بات اس کے برعکس ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو امام شاطبی نے اپنی کتاب الاعتصام اور الموافقات میں شرعی دلیلوں سے مدلل کر کے بیان کیا ہے۔

اس لئے جس شخص پر حج فرض ہو اس سے یہ کہنا جائز اور درست نہیں ہے کہ غریب مسلمانوں پر مال کا خرچ کرنا یا مفید اسلامی منصوبوں میں دولت کا لگانا، فریضہ حج کی ادائگی سے زیادہ اہم ہے یا قربانی کے جانور کی قیمت کا صدقہ کر دینا قربانی سے زیادہ بہتر ہے۔

اسی طرح یہ کہنا بھی جائز اور درست نہیں ہے کہ نئے ٹیکس زکوٰۃ کے قائم مقام ہو جاتے ہیں جب کہ زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے اور قرآن و حدیث میں نماز کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ روزوں کے سلسلے میں رمضان کو کسی اور مہینہ سے بدل لیا جائے یا نماز جمعہ کے سلسلے میں جمعہ کے دن کو کسی اور دن سے بدل دیا جائے لیکن عبادات۔ خصوصاً عبادات محضہ کے علاوہ، عادات اور معاملات کے میدان میں ہم علل و اسباب پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں اور ان احکام سے وابستہ مصالح اور مقاصد کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اگر ان تک ہماری پہنچ ہو جاتی ہے تو حکم کے اثبات اور نفی کو ان کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ "حکم" جیسا کہ علمائے محققین نے کہا ہے یہ اپنے وجود اور عدم کے سلسلے میں اپنی علت کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ جہاں علت

پائی جائے گی وہاں حکم پایا جائے گا لیکن جہاں علت یا سبب معدوم ہوگا وہاں حکم بھی معدوم ہوگا۔

آیئے اب ہم ان درج ذیل نصوص پر غور کریں۔

امام مالک، امام بخاری، امام مسلم اور اصحاب سنن نے روایت کی ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار یا دشمن کے علاقہ میں مصحف لے کر سفر کرنے سے منع کیا ہے۔"

اب جو شخص بھی اس ممانعت کی علت پر غور کرے گا۔ اس کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ممانعت اس اندیشہ پر تھی کہ کفار اس کی توہین یا بے حرمتی کریں گے۔

لیکن جب مسلمان اس اندیشہ سے مطمئن ہوں تو غیر مسلم ملکوں کے سفر میں بغیر کسی حرج کے وہ اپنے ساتھ قرآن لے جا سکتے ہیں اور اسی پر آج دنیا کے سارے مسلمانوں کا عمل بھی ہے۔ یہ بات اب کسی کی نگاہ میں معیوب نہیں ہے بلکہ آج تو حالت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں کو دنیا کے ہر گوشے میں پہنچانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ساری دنیا میں ان کا دین متعارف ہو جائے اور اس کی دعوت عام ہو جائے۔ جن ملکوں اور قوموں کی زبان عربی نہیں ہے وہاں مسلمان بھی معانی قرآن پاک کے ترجموں کو شائع کرکے یہی کوشش کر رہے ہیں

ب۔ "ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو محرم کے بغیر تنہا سفر کرنے سے منع کیا ہے۔"

ممانعت کی اس علت پر غور کرنے والوں کے لئے اس حقیقت کا ادراک دشوار نہیں ہے کہ یہ ممانعت راہ میں پیش آنے والے خطروں کے پیش نظر تھی، جب ایک عورت دور دراز کا سفر تنہا

کرتی صحرا و بیاباں سے گزرنا ہوتا اور کوئی قابل اعتماد مرد ساتھ نہ ہوتا تو لوگوں کی قیل وقال سے محفوظ رہنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ الا یہ کہ اس کی حمایت کے لئے ایک قابل اعتماد مرد ساتھ ہو اور یہ اس کا شوہر ہو سکتا ہے یا اور کوئی محرم۔

اب اگر آج کل کے سفر پر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سفر کے اسباب و وسائل بدل گئے ہیں۔ آج ہمیں ہوائی جہاز ایسی سواری ملے گی جس میں سینکڑوں آدمی بیٹھتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں یہ لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا دیتا ہے۔ ایسی حالت میں عورت کے لئے کسی اندیشہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ بشرطیکہ جہاں سے سفر شروع ہوتا ہے وہاں ہوائی اڈہ تک وہ محرم کے ساتھ جاتی ہے اور جہاں اسے اترنا ہو وہاں کوئی محرم اس کے استقبال کے لئے موجود ہو اور وہ قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ سوار ہوئی ہو۔ عورت کے حج کے سلسلے میں بہت سے فقہا نے یہی پہلو اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں نے اجازت دی ہے کہ ایک عورت، دوسری قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ یا صرف ایک قابل اعتماد عورت کے ساتھ حج کا سفر کر سکتی ہے بلکہ بعض نے تو اس رائے کا اظہار بھی کیا۔ قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ دوسری عورتوں کے بغیر بھی سفر کر سکتی ہے۔

اس سلسلے میں جو دلیلیں لائی جاتی ہیں، ان میں وہ حدیث بھی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ایک ایسے زمانے کے آنے کی بشارت دی ہے جس میں سفر کرنے والی خاتون الحیرہ (عراق) سے کعبہ شریف کا سفر کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔

ج۔ سفر کے سلسلے میں جو ہدایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ نے طویل سفر سے واپس آنے والے مسافر کو اچانک رات میں گھر والوں کے پاس جانے سے منع کیا ہے۔ آپؐ خود بھی سفر سے واپسی پر رات میں گھر میں نہیں جاتے

تھے بلکہ صبح یا شام کے وقت گھر کے اندر جاتے تھے۔

بعض روایات میں دو چیزوں کو اس ممانعت کا سبب بتایا گیا ہے۔

۱- اچانک گھر میں آنے سے ہو سکتا ہے کہ گھر والوں کو غلط فہمی ہو کہ یہ ہماری ٹوہ میں رہتے ہیں تاکہ ہماری کوئی غلطی انھیں نظر آجائے اور یہ ایسی بدگمانی ہے جسے اسلام ازدواجی تعلقات میں پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اسلام نے اس رشتے کو تقدس اور عظمت عطا کی ہے۔

۲- عورت کو جب شوہر کی آمد کی اطلاع ہوگی تو وہ اپنے کو بنائے، سنوارے گی اور جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے شوہر کے استقبال کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اسی پہلو کی طرف ایک حدیث میں اشارہ بھی کیا گیا ہے (کی تستحد المغیبۃ وتمتشط الشعثۃ) تاکہ شوہر سے دور رہنے والی عورت اپنے بدن کو صاف ستھرا کر کے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو سنوار لے۔

یہاں ہم یہ بات بھی کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا دور ایک ایسا دور ہے جس میں سفر کی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جب مسافر نے گھر والوں کو ٹیلی فون، تار یا ڈاک سے اطلاع دے دی ہے تو وہ رات اور دن میں کسی وقت بھی گھر آسکتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ اس دور میں وقت کا انتخاب مسافر کے بس میں نہیں ہوتا بلکہ ہوائی جہاز، بحری جہاز اسے اپنے نظام الاوقات کا پابند بنا دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف پرانے زمانے میں جب لوگ اونٹ پر سفر کیا کرتے تھے تو سواری ان کی ملکیت ہوتی تھی۔ جب چاہیں سفر کریں جب چاہیں قیلولہ کریں اور جہاں چاہیں رات بسر کریں۔ واپسی میں جلدی کرنا یا تاخیر کرنا مسافر کی مرضی پر موقوف تھا۔

ہم یہ بات پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ خالص عبادات کا معاملہ تعبدی ہے۔ اسے علل و اسباب کے ساتھ مقید نہیں کیا جائے گا، لیکن زکوٰۃ کا معاملہ دوسرا ہے یہ نماز، روزہ اور حج کی طرح عبادات محضہ میں نہیں ہے، بلکہ عبادت کے ساتھ ساتھ یہ اسلام کے اقتصادی اور مالی نظام کا ایک جزء بھی ہے۔ دین کا ایک بنیادی رکن ہونے کی حیثیت سے جہاں فقہ کی کتابوں میں اس کا ذکر عبادت کے ساتھ آتا ہے، وہیں اس کا ذکر خراج، اموال، احکام سلطانیہ اور سیاست شرعیہ کے ابواب میں بھی آتاہے۔ اس لئے کہ شریعت اسلامی میں یہ ایک ثابت شدہ آمدنی کا ذریعہ ہے اور اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک اہم ستون ہے۔ زکوٰۃ کے ان ہی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر فقہاء نے اس کے احکام کی علتوں کو بیان کیاہے اور "مال نامی" کو اس کے وجوب کی علت قرار دیاہے۔ خواہ یہ نامی ہونا بالفعل ہو یا بالامکان، ساتھ ہی ساتھ اسلام میں جن فقہی مسلکوں کی پیروی کی جاتی، ان سب میں اس کے احکام کے سلسلے میں قیاس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے کاشت کی زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے خواہ وہ غلہ ہو یا پھل، خشک ہو یا تروتازہ۔ کھانے کی چیز ہو یا کوئی اور چیز۔ سب پر عشر یا نصف عشر واجب ہو گا۔ یہی قول راجح ہے اس لئے کہ زکوٰۃ (عشر) کے واجب ہونے کی علتِ نمو، یہاں مال میں پائی جارہی ہے۔ نیز صاحب مال کے ساتھ یہ سبب موجود ہے۔ اسی سے اس کا مال پاک وصاف ہو گا

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (سورہ توبہ: ۱۰۳) انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ۔

فقراء اور حاجت مندوں کی صورت میں بھی یہ سبب موجود ہے

ان للفقراء حقاً فی اموال الاغنیاء مالداروں کی دولت میں فقراء کا ایک حق مقرر ہے۔

اوران ہی مالداروں کے زمرہ میں کھیت اور باغ کے مالک بھی آتے ہیں۔

اس مسئلے پر کچھ ظاہریوں نے مجھ سے بحث کرتے ہوئے کہا، یہ نصوص کے خلاف ہے

میں نے کہا، آپ کی مراد کس نص سے ہے۔

اس نے کہا، حدیث "لیس فی الخضروات صدقۃ" سبزیوں میں کوئی صدقہ نہیں

میں نے کہا، یہ حدیث ضعیف ہے، حدیث کے کسی امام نے اسے صحیح نہیں تسلیم کیا ہے۔ ایسی ضعیف حدیث دلیل نہیں بن سکتی۔ چہ جائیکہ اس سے قرآن وسنت کے عموم کو خاص کیا جائے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کی روایت کی ہے اور اسے ضعیف کہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی بتائی ہے کہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے۔

اس نے کہا، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی تو نہیں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبزیوں میں کوئی زکوٰۃ (عشر) وصول کی۔

میں نے کہا، اس اعتراض کے میرے پاس دو جواب ہیں؛

ایک جواب تو وہی ہے جو امام ابن عربی نے دیا کہ اس سلسلے میں مزید کسی منقول کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت وآتوا حقہ یوم حصادہ کافی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آپ نے سبزیوں پر زکوٰۃ نہیں وصول کی تو اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ آپ نے ان لوگوں کے ضمیر پر اعتماد کیا کہ وہ لوگ خود اس کی زکوٰۃ نکال دیں گے۔ اس لئے کہ سبزیوں اور پھلوں کی حفاظت اس دور میں دشوار تھی اور ان کے ضائع یا خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

معترض نے پھر کہا، آپ نے ایک اور حدیث چھوڑ دی جو زکوٰۃ چار چیزوں کھجور، منقیٰ، گیہوں اور جو میں محدود کر دیتی ہے۔

میں نے کہا، یہ حدیث صحیح نہیں ہے جیسا کہ ائمہ حدیث نے ثابت کر دیا ہے۔

تفصیل کے لئے میری کتاب فقہ الزکوٰۃ ملاحظہ فرمائیں۔ جن اماموں کی پیروی کی جاتی ہے ان میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیث پر اپنے مسلک کی بنیاد نہیں رکھی ہے۔ پھر اسے اس قرآنی نص کے مقابلے میں کیسے لایا جاسکتا ہے جس سے زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ (البقرہ ۲۶۷)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام ۱۴۱)

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کئے، کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جبکہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔

آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

فیما سقت الانہار والغیم العشور وفیما سقی بالساقیہ نصف العشور (مسلم)

جو کھیتی بارش یا دریا کے پانی سے سیراب ہوتی ہو اس پر عشر ہے اور جسے رہٹ وغیرہ سے سینچا گیا۔ اس پر نصف عشر ہے۔

ان نصوص کا تعلق زمین کی ساری پیداوار سے ہے کسی خاص قسم سے نہیں۔ زمین کی ہر پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اس کے لئے دلائل واضح ہیں، یہی مسلک امام ابو حنیفہؒ کا ہے اور اس سے پہلے یہ مسلک حضرت عمرؓ

بن عبدالعزیزؒ کا تھا۔ اور یہی مسلک "حکمت شریعت" سے ہم آہنگ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ راضی ہو، مالکی مسلک کے پیرو قاضی ابوبکر بن العربیؒ سے جنھوں نے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں قرآن پاک کی آیت (وھوالذی انشاء جنات) کی تفسیر کرتے ہوئے نیز حدیث "فیما سقت السماء العشر" کی اپنی کتاب "عارضۃ الاحوذی فی شرح الترمذی" میں شرح کرتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی تائید کی ہے۔ آپ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ہر مسلک کو اور اس کے استدلال کے ماخذ کو پیش کرنے کے بعد لکھا۔ رہی بات امام ابوحنیفہؒ کی تو انھوں نے اس آیت کو اپنا آئینہ بنا کر حق کو دیکھ لیا"

اسی طرح ترمذی کی شرح میں لکھا:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے سب سے قوی مسلک ہے۔ مساکین کے لحاظ سے اسی میں سب سے زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکرگزاری کے لحاظ سے بھی یہی مسلک اولیٰ نظر آتا ہے۔ نیز آیت اور حدیث کا عموم بھی اسی مسلک پر دلالت کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ہم احکام کو علتوں کی طرف نہیں لوٹائیں گے تو سخت قسم کے تناقضات میں پڑ جائیں گے۔ دو مساوی چیزوں میں تفریق کر دیں گے اور دو مختلف چیزوں کو یکساں کر دیں گے اور یہ اس عدل کا مظاہرہ نہیں ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کی شریعت قائم ہے۔

یہ درست ہے کہ یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان شرعی امور میں بغیر کسی رسوخ اور دلیل کے دخل اندازی کی جرأت کرتے ہیں اور احکام کے لئے ایسی علتیں تلاش کرتے ہیں جن کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ اپنی خواہشوں کے اشارے پر

چلتے ہیں، اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا ردعمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے بلکہ طفیلی دراندازوں کی دراندازی سے بچتے اور بچاتے ہوئے جو لوگ باصلاحیت ہیں علم دین میں رسوخ رکھتے ہیں۔ ان کے لئے اس دروازہ کو کھول دینا چاہیئے۔

فروعی مسائل سے دلچسپی اور اہم مسائل سے غفلت

دینی بصیرت میں ضعف اور علم دین میں عدم رسوخ ہی کی یہ علامت ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ فروعی مسائل میں الجھے رہتے ہیں اور ان بڑے بڑے اور اہم مسائل سے غفلت برتتے ہیں جن کا تعلق امت کے وجود اور اس کے تشخص اور مستقبل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے بڑی تعداد کو ہم دیکھتے ہیں چھوٹی بڑی داڑھی کے رکھنے پر یا تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینے پر، فوٹو گرافی پر اور ایسے ہی دیگر مسائل پر جن پر لمبی بحثیں اور کافی قیل و قال ہو چکا ہے۔ ہنگامہ برپا کر کے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جبکہ لادینی نظام حیات یا سیکولرزم کی یلغار جاری اور الحادی مارکسیت کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے۔ صیہونیت اپنے قدم جما رہی ہے صلیبی گروہ اپنی چالیں چل رہا ہے اور اسلام سے علیحدہ ہونے والے باطل فرقے امت مسلمہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے قدیم ترین اسلامی ممالک نئی صلیبی یلغار سے دوچار ہیں اور ان کے تاریخی اور اسلامی تشخص کو مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ اسلام کے سچے اور مخلص داعیوں کو دبایا جا رہا ہے۔

ان حالات میں تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ جو لوگ علم یا روزی حاصل کرنے کے لئے سمندر پار کر کے امریکہ، کناڈا اور یورپ گئے۔ وہ لوگ وہاں اپنے ساتھ ساتھ یہ فروعی جھگڑے بھی لے گئے ہیں۔

اس طرح کے فروعی اور اجتہادی مسئلوں پر گروہ بندیوں اور جھگڑوں کے آثار کو اکثر و بیشتر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے حالانکہ اجتہادی مسائل میں مذہب اور رایوں کا اختلاف آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

کاش یہ لوگ ان فروعی مسائل پر جنگ و جدال کا بازار گرم کرنے کے بجائے اپنی کوششیں ان چیزوں پر صرف کرتے جن سے مسلمانوں اور نئی نسل کے عقائد کی حفاظت ہوتی۔ انھیں فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرتی۔ کبائر کے ارتکاب سے بچاتی اور اگر ان غیر اسلامی ممالک میں مسلمان ان تین چیزوں عقیدہ کی حفاظت، فرائض کی ادائیگی اور کبائر سے اجتناب کے باب میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی۔

سچ مچ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ لوگ فروعی مسائل پر معرکہ گرم کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ راکھ میں دبی چنگاریوں کو شعلہ بنا دیں۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بنیادی ذمہ داریوں مثلاً والدین کے ساتھ نیک سلوک اور بال بچوں کے حقوق، روزی کے حلال ذرائع کا انتخاب، کام کو اچھے ڈھنگ سے انجام دینے اور پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ان تمام باتوں سے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور اپنے پسندیدہ اور مرغوب جھگڑوں میں رات دن لگے رہتے ہیں اور اس کا آخری انجام بدترین لڑائی جھگڑا اور شدید ترین دشمنی ہی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

اسی قسم کے جدال کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

ماضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الا اوتوا الجدل — کوئی قوم ہدایت ملنے کے بعد اس وقت گمراہ ہوتی ہے جب وہ جدال میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

اس موقع پر مجھے وہ بات بھی یاد آ رہی ہے جسے امریکہ میں رہنے والے بعض دوستوں نے بیان کیا۔ ایک صاحب اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے کھانے کی شدّت سے مخالفت کیا کرتے جبکہ اس کے حلال ہونے پر کچھ نئے اور پرانے علماء کا فتویٰ بھی ہے لیکن یہ صاحب پوری شدت سے مخالفت پر ڈٹے رہے۔ دوسری طرف ان کی حالت یہ تھی جیسا کہ بہت سے معتبر لوگوں نے بیان کیا کہ ان کے دستر خوان پر شراب بھی ہو تو انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ ایک مشتبہ اور اخلاقی چیز کے بارے میں شدّت اور کھلی ہوئی حرام چیز کے بارے میں یہ غفلت اور تساہلی؟

کبائر کے ارتکاب پر جرأت اور معمولی چیزوں کے بارے میں جدال و نزاع اور وسوسہ اندازی کا رویہ؟ یہی وہ پُر تضاد موقف تھا جس نے بزرگ صحابی عبداللہؓ کو اس وقت غضب ناک بنا دیا تھا جب کسی عراقی نے حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد حج کے موقع پر ان سے پوچھا کہ حج کے دوران مچھر وغیرہ کو مار دیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔

امام احمدؒ نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن ابی نعیمؒ سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا، پھر اس نے مچھر کے خون کے بارے میں سوال کیا، یا اس نے یہ سوال کیا کہ اگر احرام کی حالت میں کوئی شخص مکھی کو قتل کر دے تو کیا حکم ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سائل سے پوچھا: آپ کی تعریف؟ ـــــ اس نے جواب دیا میں عراق کا باشندہ ہوں ـــــ اتنا سننا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: لوگو! ذرا انھیں دیکھو، یہ مچھر کے خون کے بارے میں سوال کررہے ہیں، جبکہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرچکے ہیں۔ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے، یہ دونوں یعنی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ میرے لئے دو خوشبو دار پھول ہیں۔

تحریم کے سلسلے میں اسراف کا رویہ

شدت پسندی کا رویہ اپنانے سے قرآن پاک، حدیث شریف اور سلف کے اقوال میں خبردار کئے جانے کے باوجود دینی امور میں ہمیشہ تنگی اور شدت پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور چیزوں کو حرام قرار دینے کے سلسلے میں اسراف کا رویہ اپنانا، محرمات کے دائرے کو وسیع کرنا، شریعت کی وسعت سے عدم آگاہی اور علم دین میں عدم رسوخ کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (النحل ۱۱۶)

اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو جو لوگ اللہ پر افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔

اسلاف کا یہ رویہ تھا کہ جس چیز کے حرام ہونے کا یقینی علم حاصل ہوتا تھا اسی کو حرام کہتے تھے اور اگر اس کے حرام ہونے کا یقینی علم نہیں ہوتا تو ایسے مواقع

پر کہتے، ہم اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ جائز نہیں ہے یا اسی سے ملتی جلتی عبارت استعمال کرتے تھے، لیکن کھلے طور پر اسے حرام نہیں قرار دیتے تھے، لیکن جن لوگوں کے اندر غلو پایا جاتا ہے وہ بغیر کسی تحفظ کے چیزوں کو حرام قرار دینے میں جلدی کرتے ہیں۔ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں، وہ ایسا پرہیزگاری اور احتیاط کے پیش نظر کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

اگر کسی مسئلے میں فقہاء کی دو رائیں ہوں، ایک اباحت کے حق میں ہو اور دوسری کراہت، تو یہ لوگ کراہت والی رائے کو اختیار کریں گے، اسی طرح کسی چیز کے بارے میں اگر ایک قول یہ ہو کہ وہ مکروہ ہے اور دوسرا قول یہ ہو کہ وہ حرام ہے تو یہ حرام قرار دینے والے قول کو اپنائیں گے۔

اسی طرح کسی چیز کے بارے میں اگر فقہاء کی دو رائیں ہوں، ایک میں آسانی اور نرمی پائی جاتی ہو اور دوسری میں سختی اور تنگی پائی جاتی ہو تو ان کا جھکاؤ ہمیشہ سختی اور تنگی کی طرف رہے گا۔ یہ ہمیشہ ابن عمرؓ کی شدت پسندی کا ساتھ دیں گے اور کسی دن بھی ابن عباسؓ کی رخصتوں کے ساتھ کھڑے نظر نہ آئیں گے۔ شدت پسندی کا یہ مظاہرہ اکثر اس لئے ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو دوسرے پہلو سے آگاہی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں جانتے کہ اس میں رخصت اور آسانی کا پہلو بھی ہے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر پانی پی رہا ہے تو اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا، بیٹھ جاؤ۔ تم نے سنت کی مخالفت کی ہے۔ اور ایک ممنوع چیز کا ارتکاب کیا ہے لیکن اس آدمی کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ ڈانٹ ڈپٹ کیوں ہو رہی ہے، اسی لئے کہنے کے باوجود بیٹھا نہیں۔ اس پر یہ صاحب غضب ناک ہو کر بولے۔ اگر تم مسلمان ہو تو تمہارے لئے لازم ہے کہ جو کچھ کھڑے ہو کر پیا ہے اسے قے کر دو۔

میں نے ان صاحب سے کہا ، یہ معاملہ اس ڈانٹ ڈپٹ اور سختی کا نہیں ہے اس لئے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اختلافی مسائل میں مخالفت کا یہ رویہ درست نہیں ہے اور اگر مخالفت درست بھی ہو تو یہ سختی اور تندی مناسب نہیں ہے۔

میری یہ بات سن کر ان صاحب نے کہا، لیکن حدیث میں تو کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا گیا ہے۔ (ومن نسی فلیستقیٔ) اور جو بھول کر پانی پی لے تو اسے قے کر دینی چاہیئے۔

میں نے کہا، لیکن کھڑے ہو کر پانی پینے کے سلسلے میں جواز والی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں۔ اسی لئے امام بخاری نے انھیں بابُ الشرب قائماً کے تحت درج کیا ہے لیکن ممانعت والی حدیثوں میں سے کسی کی روایت نہیں کی ہے

امام ترمذیؒ وغیرہ نے بھی کھڑے ہو کر پانی پینے کے سلسلے میں کئی صحابہؓ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اسی طرح کھڑے ہو کر پینے کا ثبوت آپؐ کی زندگی کے آخری دور سے بھی ملتا ہے جیساکہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں کیا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر وضو سے بچا ہوا پانی پیا۔ پھر کہا، کچھ لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسے ہی کیا تھا جیساکہ میں نے ابھی کیا ہے یعنی کھڑے ہو کر وضو کے بچے ہوئے پانی کو پیا۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے ہوئے کھاتے تھے اور پانی پیتے تھے۔ اس حال میں کہ ہم کھڑے ہوتے تھے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اسی طرح حضرت کبشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے لٹکے ہوئے مشکیزے سے پانی پیا۔

حضرت عمرؓ سے بھی کھڑے ہو کر پانی پینا ثابت ہے۔ نیز مؤطا میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔ حضرت سعدؓ اور حضرت عائشہؓ کے خیال میں کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تابعینؒ کے ایک گروہ سے بھی اس سلسلے میں رخصت ثابت ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان تمام باتوں کا ذکر فتح الباری میں کیا ہے۔ پھر اس مسئلہ میں علماء کے مسالک کا بھی ذکر کیا۔ علماء میں وہ لوگ بھی ہیں جو جواز کی حدیث کو ممانعت والی حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جواز والی حدیثیں سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہیں۔ نیز کچھ علماء کے نزدیک جواز والی حدیثیں ممانعت والی حدیثوں کی ناسخ ہیں۔ اس لئے کہ جواز والی حدیثوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دور سے ہے۔ نیز خلفائے راشدین کے عمل سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ اسی طرح کچھ علماء نے ممانعت والی حدیثوں کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے یہ بات آجائے کہ ان میں کیا اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔

ان تمام نقطہ ہائے نظر کو سامنے رکھ کر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کو معیوب سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس کے سلسلے میں شدت برتی جائے۔

اسی سے ملتا جلتا مسئلہ لباس کا بھی ہے کہ اسے ٹخنوں سے نیچے نہیں ہونا چاہیئے اور بہت سے دیندار نوجوان اپنے سماجی اور خاندانی ماحول کے علی الرغم اس کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو لباس ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ حرام ہے اور دلیل میں یہ صحیح حدیث پیش کی جاتی ہے۔

ما اسفل من الکعبین فھو فی النار — ٹخنوں سے نیچے جو لباس ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔

اس مسلک کے ماننے والے ان حدیثوں سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ جن میں اسبال ازار اور زمین پر گھسیٹتے ہوئے لباس کے سلسلے میں سخت ترین وعید آئی ہے۔

لیکن ان مطلق حدیثوں کو ایک اور حدیث نے مقید کر دیا ہے جو لوگ فخر اور تکبر سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ وعید انھیں کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بھی اٹھلانے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے:

من جر ثوبہ من الخیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ — جو شخص تکبر سے اپنے لباس کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔

انہیں سے یہ دوسری حدیث بھی مروی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باذنی ھاتین یقول: من جر ازارہ، لا یرید بذالک الا المخیلۃ فان اللہ لا ینظر الیہ یوم القیامۃ — میں نے اپنے ان دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو تکبر سے زمین پر اپنے ازار کو گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "میرا ازار ٹخنوں سے نیچے چلا جاتا ہے الّا یہ کہ میں دھیان رکھوں، تو آپؐ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کے باعث اپنے ازار کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ اسی لئے امام نووی وغیرہ نے اسے مکروہ کہا ہے اور یہ کراہت کسی معمولی ضرورت سے بھی زائل ہو سکتی ہے۔

اصول شریعت اور مقاصد رسالت کے سلسلے میں اس بے بصیرتی اور

تاریکی نے اسلامی قدروں اور بنیادوں کو سمجھنے میں بڑی مشکلات پیدا کی ہیں۔ نئی نسل کے ذہن کو پراگندہ کیا ہے اور ان میں سے بہتوں کے ذہنوں میں صحیح اور غلط مفہوم گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔

حالانکہ ان میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی تحدید و توضیح لازمی ہے مثلاً ایمان، اسلام، کفر، شرک، نفاق، جاہلیت۔ اس لئے کہ ان ہی کی بنیاد پر دوسروں پر حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسروں سے تعلقات کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔

لیکن جن لوگوں کو نہ عربی زبان کا ذوق ہے نہ اس کے اسرار سے آگاہی ہے انھیں لوگوں نے ان بنیادی اور اساسی چیزوں کے مفہوم کو متعین کرنے میں حقیقت اور مجاز کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اسی لئے معاملات مشتبہ ہو گئے، راہیں مشکوک ہو گئیں اور پیمانے گڈمڈ ہو گئے۔ ان لوگوں کے نزدیک ایمان مطلق اور مطلق ایمان میں اور اسلام کامل اور مجرد اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح یہ لوگ کفر اکبر جو ملت سے خارج کر دیتا ہے اور کفر معصیت میں نہ کوئی فرق کرتے ہیں اور نہ شرک اکبر اور نہ شرک اصغر میں۔ اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک عقیدہ کے نفاق اور عمل کے نفاق میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق، سلوک اور برتاؤ کی جاہلیت اور عقیدہ کی جاہلیت یکساں ہے۔

اسی لئے یہاں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے مفہوم پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے چلیں تاکہ یہ فکری تاریکی عظیم خطروں سے دوچار نہ کر سکے۔ پس جب ایمان مطلق استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے اندر دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعضاء و جوارح کا عمل شامل ہوتا ہے۔

اسی ایمان کا ذکر قرآن پاک کی درج ذیل آیتوں میں کیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (الانفال ۲)

اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ (المؤمنون ۲)

یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۱۵)

حقیقت میں مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔

اسی طرح حدیثِ رسول میں آیا ہے:

من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیصل رحمہ فلیقل خیرا اولیصمت

جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو اسے صلہ رحمی کا رویہ اپنانا چاہیے اور بولے تو بھلی بات بولے ورنہ خاموش رہے

اور اسی ایمان کامل کی نفی ذیل کی حدیثوں میں کی گئی:

لایؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن

زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا اور جب شراب پینے والا شراب پیتا ہے تو وہ ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا اور جب چور چوری کرتا ہے تو وہ ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا۔

پس ان حدیثوں میں کمال ایمان کی نفی کی گئی ہے نہ کہ اصل ایمان کی، یہ ایسی بات ہے جیسے آپ کہتے ہیں جو اپنے اہل پر غیرت نہ کھائے وہ مرد نہیں، یا جو اپنے علم پر عامل نہ ہو وہ عالم نہیں ۔ ان فقروں میں کمال رجولیت اور کمال علم کی نفی کی گئی ہے نہ کہ نفس آدمی اور نفس علم کی اور یہ ایمان کامل وہی ہے جس کے بارے میں حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ اس کے ستر سے کچھ زائد شعبے ہیں اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

اسی ایمان کامل کے موضوع پر امام ابوبکر البیہقی نے اپنی کتاب الجامع لشعب الایمان، لکھی ہے۔ ان شعبوں نے شجر اسلام کی جڑ یعنی عقائد کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے۔ نیز عبادات، معاملات، اخلاق اور آداب کے روپ میں اس کی شاخوں اور پھلوں کو بھی اپنے اندر سمو لیا ہے تو جو جڑ ہی کو بالکل ضائع کر دے وہ مطلق ایمان ہی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن جو شاخوں کو ضائع کرتا ہے تو وہ بقدر ضیاع کمال ایمان سے محروم ہوتا ہے نفس ایمان سے نہیں۔ اور اس پر ہم کفر کا حکم نہیں لگا سکتے اور اصل ایمان وہی ہے جس کا ذکر حدیث جبرئیل میں موجود ہے:

الایمان ۔ ان تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر

ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آؤ اور قدر پر ایمان رکھو۔

ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ سلف کا قول ہے کہ ایمان دل کے اعتقاد، زبان کے نطق اور اعضاء وجوارح کے عمل کا نام ہے اور اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اعمال ایمان کے کمال کے لئے شرط کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی

بنیاد پر ان لوگوں نے یہ بات بھی کہی کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ مرجئہ کے نزدیک ایمان، اعتقاد قلبی اور نطق لسانی کا نام ہے۔ کرامیہ کے نزدیک ایمان نطق کا نام ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ایمان، عمل، نطق اور اعتقاد کا نام ہے۔ ان لوگوں اور سلف کے درمیان فرق یہ ہے کہ یہ لوگ اعمال کو ایمان کی صحت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں جبکہ سلف نے اعمال کو کمال ایمان کے لئے شرط قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ان تمام باتوں کا تعلق اللہ کے نزدیک ایمان کے صحیح اور درست ہونے اور نہ ہونے سے ہے لیکن ہم انسانوں کے لحاظ سے، ایمان صرف اقرار کا نام ہے تو جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے۔ دنیا میں اس پر اسلام کے احکام جاری کئے جائیں گے اور اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ الا یہ کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو اس کے کفر کا ثبوت بن جائے۔ جیسے بت کو سجدہ کرنا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ نیز کبھی کسی کے لئے ایمان کا لفظ اس کے اقرار کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی کمال ایمان کے پیش نظر اس کے ایمان کی نفی کی جاتی ہے اسی طرح کبھی جب کوئی ایسا کام کرتا ہے جو کفر کی راہ پر چلنے والے کرتے ہیں تو اس پر لفظ کفر کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ عمل کافرانہ ہوتا ہے وہ شخص کافر نہیں ہوتا اور اس سے کفر کی نفی کی جاتی ہے اور کبھی کبھی کلمہ شہادت کے پڑھنے کو بھی اسلام کہتے ہیں۔ یہ کلمہ اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ اس کلمہ کے پڑھتے ہی ایک غیر مسلم نماز، زکوٰۃ وغیرہ ادا کئے بغیر مسلمان بن جاتا ہے اور مسلمانوں میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ان عبادتوں کی قبولیت کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ پس کسی کے مسلمان ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ان فرائض کو تسلیم کرے اور اسے اپنے لئے لازم گردانے اگرچہ عملاً ابھی اس نے ان کو ادا نہ کیا ہو۔ یہی شہادت

انسان کے جان ومال کو محفوظ کر دیتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔
جن لوگوں نے اس کلمہ کو مان لیا۔ ان لوگوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا الاّ یہ کہ اسی کی بنیاد پر ان سے کوئی مواخذہ ہو اور رہی یہ بات کہ کلمہ کے اقرار میں یہ سچے ہیں یا نہیں تو یہ حساب اللہ پر ہے اور کبھی کبھی اس کا اطلاق اسلام کے بنیادی ارکان پر ہوتا ہے، جیسا کہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے (۱) یہ شہادت دینا کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں (۲) نماز کا قائم کرنا (۳) زکوٰۃ کا ادا کرنا (۴) رمضان کے روزے رکھنا (۵) خانہ کعبہ کا حج کرنا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی یہی تشریح اس حدیث میں کی ہے جو حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہے۔ جب جبرئیل نے پوچھا: اسلام کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ان تعبد اللہ ولا تشرك به شيئًا وتقيم الصلوٰة المكتوبة وتؤتي الزكوٰة المفروضة وتصوم رمضان

اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور فرض نمازوں کو قائم کرو اور فرض زکوٰۃ کو ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔

یہاں حدیث جبرئیل میں ہمیں ایمان اور اسلام کے مفہوم میں فرق محسوس ہوتا ہے لیکن قرآن میں یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے بغیر نہ ایمان پایا جا سکتا ہے اور نہ ایمان کے بغیر اسلام۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور اسلام کا تعلق اعضاء وجوارح اور ظاہری اعمال سے ہے اسی حقیقت کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

الاسلام علانية والايمان في القلب۔۔
(احمد، البزار)

اسلام کھلا ہوا ہے یعنی اس کا تعلق اعضاء وجوارح کے اعمال سے ہے اور ایمان دل میں ہے۔

اسی مفہوم پر سورہ حجرات کی یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ	یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی اسلام کا لفظ ایمان کامل کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ ذیل کی حدیثوں سے واضح ہوتا ہے:

الاسلام ان یسلم قلبك لله ویسلم المسلمون من لسانك ویدك	صحیح اسلام یہ ہے کہ تمہارا دل اللہ کا مطیع ہو جائے اور مسلمان تمہاری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔
المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده	مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔
احب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلماً	لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تو تم سچے مسلمان ہو جاؤ گے۔

اب رہی بات لفظ کفر کی تو لسان شرع میں اس کا استعمال، انکار اور اللہ اور اس کے پیام کو جھٹلانے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا (النساء ۱۳۶)	اور جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

اور کبھی کبھی یہ لفظ اسلام سے ارتداد اور دائرہ ایمان سے خارج ہونے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

(المائدہ ۵)

اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہوجائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲۱۷)

تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا۔ اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوجائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

کبھی کبھی لفظ کفر کا استعمال ان عملی گناہوں کے لئے ہوتا جس میں اللہ کے انکار یا اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ امام ابن القیم نے اپنی کتاب 'مدارج السالکین' میں لکھا ہے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں۔ کفر اکبر اور کفر اصغر۔

کفر اکبر: یہ جہنم کی ابدی سزا کا موجب ہوتا ہے۔

کفر اصغر: اس پر سزا کی وعید آئی ہے۔ لیکن ابدی سزا کا موجب نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت میں دو طرح کے لوگ ایسے ہیں جن کے اندر کفر پایا جاتا۔ ایک نسب میں طعن کرنے والا، دوسرا میت پر نوحہ کرنے والا۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جس نے عورت کے ساتھ ہم بستری میں دبر کا استعمال کیا اس نے اس چیز سے کفر کیا۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی ہے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے:

من اتی کاھنا او عرافا فصدقہ بما یقول، فقد کفر بما أنزل علیٰ محمد

جو شخص کاہن یا نجومی کے پاس جاتا ہے اور اس کی باتوں کو سچ بھی مانتا ہے تو اس نے اس چیز کا انکار کر دیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی ہے۔

ولا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض
میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے پھرو۔

حضرت ابن عباسؓ اور عام صحابہؓ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون کی یہی تاویل کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ اس آیت میں کفر سے مراد وہ کفر نہیں جو ملت سے خارج کر دیتا ہے بلکہ جب کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا یہ عمل کفر کا عمل ہوتا ہے لیکن یہ کفر باللہ اور کفر بالیوم الآخر کی طرح نہیں ہے۔ حضرت طاؤسؒ نے بھی اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عطاءؒ نے کہا ہے کہ ان آیتوں میں کفر، ظلم اور فسق کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ حقیقی کفر اور حقیقی ظلم اور فسق کے مفہوم میں نہیں استعمال ہوئے ہیں بلکہ ان کا یہاں استعمال حقیقی مفہوم سے کمتر کے لئے ہوا ہے۔

حضرت عکرمہؓ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کا انکار کرنا اور اس کے مطابق فیصلہ نہ کرنا کفر ہے۔ لیکن یہ تاویل صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ شریعت کا انکار خود ہی کفر ہے۔ چاہے کوئی اس کے مطابق فیصلہ کرے یا نہ کرے۔

کچھ علماء کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ توحید اور اسلام کے اقرار کے باوجود اللہ کے نازل کردہ تمام احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، یہ آیتیں انھیں سے متعلق ہیں۔ آیت کی یہ تاویل عبدالعزیز الکنانی نے کی ہے لیکن یہ تاویل بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق

فیصلہ نہ کرنے کے سلسلے میں جو وعید آئی ہے اس کا تعلق جس طرح سارے احکام سے ہے، اسی طرح بعض احکام سے بھی ہے۔

کچھ علماء کا یہ خیال ہے کہ اس آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر قصداً نص کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ علماء کی یہ رائے البغوی نے نقل کی ہے۔

بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے حضرت قتادہؓ اور حضرت الضحاکؒ اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں کی رائے بھی یہی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ بھی اس مفہوم سے ہم آہنگ نہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں تو ان کا یہ عمل اس کفر کی تعریف میں آیا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے خلاف فیصلہ کرنا حاکم کے حسب حال دونوں طرح کے کفر یعنی کفر اصغر اور کفر اکبر کو شامل ہے۔ پس کسی واقعہ میں فیصلہ کرتے وقت اگر حاکم یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکامات کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے۔ پھر بھی وہ اس سے انحراف کر کے معصیت کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ لیکن وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس سے غلطی ہوئی اور وہ سزا کا مستحق ہے تو یہ کفر اصغر ہے اور اگر وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کو اللہ کا حکم جانتے ہوئے اسے غیر واجب قرار دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اس کے مطابق فیصلہ کرے، چاہے تو نہ کرے، تو یہ کفر اکبر ہے اور اگر وہ اللہ کے حکم سے آگاہ نہ ہو یا غلطی کر جائے تو اس کے لئے وہی حکم ہے جو غلطی کرنے والوں کے لئے ہے۔

مختصر یہ کہ ہر معصیت کفر اصغر کی قسم میں داخل ہے۔ اس لئے کہ وہ شکر کی ضد ہے اور شکر وہ عمل ہے جو اللہ کی اطاعت میں ہو۔ پس ہر تگ و دو یا تو شکر ہے یا کفر، یا پھر تیسری قسم میں داخل ہے یعنی نہ شکر ہے نہ کفر، بلکہ اس کا شمار خطا میں ہوگا واللہ اعلم۔

اسی طرح شرک کی بھی دو قسمیں ہیں شرک اکبر اور شرک اصغر۔ شرک اکبر یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ یا اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دیوی دیوتاؤں کو پکارا جائے۔

یہی وہ شرک ہے جس کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ

(النساء ۴۸)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

شرک اصغر یہ ہے کہ جیسے کوئی غیر اللہ کی قسم کھائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من حلف بغیر اللہ فقد اشرک

(ابوداؤد، الترمذی، الحاکم)

جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

ان الرقی والتمائم والتولۃ شرک

بیشک جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈہ اور جادو ٹونا شرک ہے۔

یہ حدیث ابن حبانؒ اور حاکمؒ نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

اسی طرح نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں، نفاق اکبر اور نفاق اصغر۔ نفاق اکبر عقیدہ کا نفاق ہے کہ دل میں تو کفر ہو لیکن زبان سے دھوکہ دینے کے لئے ایمان

کا اظہار کرے، سورۂ بقرہ کے شروع میں اسی نفاق کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
(البقرہ ۸ - ۹)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ
(البقرہ ۱۴)

جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔

اسی نفاق کا ذکر سورہ المنافقون کے آغاز میں بھی آیا ہے اور اسی پر قرآن پاک میں یہ وعید آئی ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا
(النساء ۱۴۵)

یقین جانوں کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

اب رہی بات نفاق اصغر کی، تو اس کا تعلق عمل سے ہے یعنی کسی مسلمان کی عملی زندگی میں کوئی ایسی بات یا صفت پائی جائے جو منافقین کے ساتھ خاص ہو لیکن وہ دل میں اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ بات متعدد حدیثوں میں آئی ہے

اٰیۃ المنافق ثلاث اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان (متفق علیہ)

منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔

اسی طرح بخاری اور مسلم میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ :

اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً ومن کانت خصلۃ منھن کان فیہ خصلۃ من النفاق حتیٰ یدعھا واذا احدث کذب واذا ائتمن خان واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر

یہ چار باتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس کے اندر ان میں سے ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی تاآنکہ اسے چھوڑ دے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے اور جب عہد کرے تو اسے توڑ دے اور پورا نہ کرے اور جب کسی سے جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

یہی وہ نفاق ہے جس کے بارے میں صحابہؓ اور سلف اندیشہ محسوس کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا مگر منافق لیکن مومن اس سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہے۔

متشابہات کی پیروی اور محکمات سے اعراض

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بنیادی سبب کی طرف بھی اشارہ کرتے چلیں جو پہلے بھی اور آج بھی فہم دین کے سلسلے میں انحراف اور غلو کا سبب بنتا رہا ہے، اس انحراف کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لوگ واضح اور محکم نصوص کو چھوڑ کر متشابہات کی اتباع میں لگے رہتے ہیں جبکہ محکمات سے اعراض اور متشابہات کے پیچھے دوڑنا ان لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا جن کا شمار راسخین فی العلم میں ہوتا ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے :

فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ (آل عمران ۷)

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

متشابہ سے مراد وہ نصوص ہیں جن کا مدلول معین نہیں ہوتا اور جن کے معنی میں ابہام ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف محکم نصوص کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ مدلول متعین ہوتا ہے اور معنی میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیں گے کہ غالی اور بدعتی حضرات قدیم زمانے سے متشابہات کے پیچھے بھاگتے ہیں اسی سے اپنی جھولی بھرتے ہیں اور اسی کو اپنا اثاثہ بناتے ہیں محکمات سے اعراض کرتے ہیں۔ جبکہ محکمات ہی قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کے دور کے غالیوں کو بھی دیکھئے، وہ بھی اہم ترین مسائل کے سلسلے میں متشابہات ہی کو بنیاد بناکر انتہائی خطرناک نتائج کا استخراج کرتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر افراد اور جماعتوں کے غلط اور صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہیں اور اسی سے تعلقات کی نوعیت متعین کرتے ہیں اسی کو دوستی اور دشمنی کی بنیاد بناتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون مسلمان ہے اور اس سے قلبی لگاؤ کا تعلق قائم کیا جاسکتا ہے اور کون خدا کا منکر ہے اور اس سے جنگ کی جاسکتی ہے

سوجھ بوجھ کی یہ سطحیت حکم لگانے میں یہ جلد بازی، احکام کو غور و فکر کے بغیر نصوص سے اچک لینے کی یہ کیفیت نتیجہ ہے محکم اور واضح نصوص کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کرنے کا، اسی چیز نے پہلے زمانے میں خوارج کو تکفیر کی دل دل میں ڈال دیا تھا اور وہ اس غلط گمان میں مبتلا ہوگئے تھے کہ ان کے علاوہ دوسرے مسلمان، مسلمان نہیں ہیں۔ اسی بنیاد پر اس گروہ نے جو تھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جنگ کی۔ جبکہ پہلے یہ لوگ حضرت علی رضی کی فوج کے سپاہی تھے۔ لیکن اپنے رویہ کی تبدیلی کے لئے ان لوگوں نے اللہ کے دین میں ایک عجیب و غریب اور انوکھی بنیاد تلاش کی۔ حضرت معاویہ رض سے جنگ کے دوران حضرت علی رض نے اپنی فوجوں میں اتحاد کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کو خونریزی سے بچانے کے لئے جب تحکیم کی تجویز منظور کرلی تو یہ خوارج

اس عظیم شخصیت کو اپنی تہمتوں کا نشانہ بنانے لگے جو اپنے بچپن ہی سے اسلام کے لئے سینہ سپر بنا رہا اور کہنے لگے، یہ تو اسلام سے نکل گئے، اس لئے کہ اللہ کے دین میں انسان کو حکم مان لیا۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن کی آیت "ان الحکم الا للہ" کو بنیاد بنا کر لا حکم الا للہ کا نعرہ لگانے لگے، ان لوگوں کے اس اعتراض کا حضرت امام علیؓ نے جو جواب دیا وہ ایک تاریخی مقولہ بن گیا ہے۔ حضرت علیؓ نے ان کے جواب میں کہا:

'کلمۃ حق یراد بہا الباطل، بات تو سچی ہے لیکن اس کے پیچھے خوارج کا جو مقصد ہے وہ باطل ہے۔ اس لئے کہ فیصلہ کے لئے ہر معاملہ میں چاہے وہ طبعی ہو یا تشریعی اللہ کی ہی طرف لوٹنا چاہیئے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا طبعی نظم اسی کے ہاتھ میں ہے اور صرف اسی کو تشریع کا حق حاصل ہے لیکن اس سے یہ بات باطل نہیں ہو جاتی کہ لوگوں کے باہمی اختلافات کو طے کرنے کے لئے جزوی مسائل میں انسان اللہ کی شریعت اور حکم کے دائرے میں رہتے ہوئے قانون بنائے۔

اسی تحکیم کے مسئلہ پر خیر الامت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے خوارج سے بحث کی اور کتاب اللہ سے ان پر حجت قائم کی۔ عائلی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان اگر اختلافات پیدا ہو جائیں تو ان کو حل کرنے کے لئے قرآن نے اسی تحکیم کے طریقے کو اپنانے کی نصیحت کی ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (النساء ۳۵)	اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔ وہ دونوں

اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص حالت احرام میں کسی شکار کو مار ڈالے تو اس سلسلہ میں بھی تحکیم کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ .... (المائدہ ۹۵)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا۔ جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا یا نہیں تو اس گناہ کے کفارہ میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ ....

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور رسول اللہ صلعم کی حدیثوں پر ایمان رکھتے ہوئے نہ ان کو صحیح طور سے سمجھتا ہے۔ نہ ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے، نہ ان میں غور و فکر سے کام لیا ہے، نہ اول و آخر کو یکجا کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ خاص و عام سے آگاہی رکھتا ہے۔ نہ اسے مطلق اور مقید اور محکمات اور متشابہات کی کچھ خبر ہے تو ایسا شخص صحیح راستے سے جلد بھٹک سکتا ہے۔ راہ اس کے لئے تاریک ہو سکتی ہے اور وہ تاریکی میں اندھوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا۔

یہی وہ غلطی ہے جس میں آج کے دور کے تکفیر کے داعی پڑے ہوئے ہیں اور ماضی میں اسی غلطی کا ارتکاب خوارج نے کیا۔ اس غلو کا بنیادی سبب جیسا کہ امام شاطبی نے لکھا ہے: مقاصد شریعت سے عدم آگاہی اور تحقیق کے بغیر ظن و گمان سے مفہوم متعین کرنے کی روش ہے اور یہ شیوہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھیں علم دین میں رسوخ حاصل

ہوتا ہے، دیکھو یہ خوارج دین سے اسی طرح دور ہو گئے جس طرح تیر شکار کے پار ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے:

یقرؤن القرآن ولا یجاوز تراقیھم — وہ لوگ قرآن تو پڑھتے ہیں لیکن وہ ان کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔

اس ارشاد سے آپؐ کی مراد یہ تھی کہ یہ لوگ غور و فکر اور سمجھ بوجھ کر قرآن کو نہیں پڑھتے کہ وہ ان کے دلوں تک پہنچ سکے۔ اس لئے کہ فہم کا تعلق دل سے ہے۔ قرآن جب تک دل میں نہ اترے تب تک اس کا سمجھنا مشکل ہے اور وہ آواز اور حروف کے مخارج تک رکا رہتا ہے اور جب معاملہ اصوات اور حروف کے مخارج تک محدود ہو کر رہ جائے تو اس میں سمجھنے والے اور نہ سمجھنے والے دونوں شریک ہو جاتے ہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ اس حدیث میں بھی کیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ علم دلوں سے کھینچ نہیں لیا جاتا ہے بلکہ اہلِ علم اٹھا لئے جاتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ابن عباسؓ کی جو تفسیر ہے۔ ابو عبید نے "فضائل القرآن" میں اس کی تخریج کی ہے اور سعید بن منصور نے اپنی تفسیر میں ابراہیم التیمی سے روایت بیان کی ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ تنہائی میں سوچنے لگے۔ یہ امت اختلاف میں کیوں کر مبتلا ہو گی جبکہ اس کا نبی بھی ایک ہے۔ پھر آپؓ نے ابن عباسؓ کو بلا بھیجا اور ان سے کہا، یہ امت آپس میں کیوں کر اختلاف کرے گی جبکہ اس کا نبی بھی ایک ہے، قبلہ بھی ایک ہے اور کتاب بھی ایک ہے۔ حضرت عمرؓ کی بات سن کر حضرت ابن عباسؓ نے کہا:

امیر المومنین! قرآن پاک ہم لوگوں پر یعنی ہمارے زمانے میں نازل ہوا، ہم لوگوں نے اسے پڑھا۔ ہم لوگ اس کے اسباب نزول کو بھی جانتے ہیں۔ لیکن ہمارے بعد ایسے

لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے لیکن انھیں اس کا علم نہیں ہوگا کہ ان آیتوں کا سبب نزول کیا ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کی رائے الگ الگ ہوگی اور یہی چیز اختلاف کا سبب بن جائے گی

حضرت سعیدؓ نے کہا: جب ہر گروہ کی الگ الگ رائے ہوگی تو آپس میں اختلاف ہوگا اور جب یہ اختلاف ہوگا تو آپس میں جنگ وجدال کی نوبت بھی آئے گی۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے زجر و توبیخ کی اور حضرت علیؓ نے بھی جھڑک دیا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ واپس چلے گئے، پھر جب ابن عباسؓ چلے گئے تو ان کی باتوں پر حضرت عمرؓ نے دوبارہ غور کیا اور انھیں بلا بھیجا۔ پھر جب حضرت ابن عباسؓ آئے تو ان سے کہا، جو باتیں آپ نے کہی تھیں انھیں دوبارہ سُنا دیجئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اپنی کہی ہوئی بات دہرادی تو حضرت عمرؓ ان کی بات کی تہ تک پہنچ گئے اور وہ انھیں بہت پسند آئی۔

علامہ الشاطبیؒ فرماتے ہیں کہ "ابن عباسؓ نے جو کچھ کہا وہی صحیح بات ہے" کیونکہ جب آدمی کو یہ معلوم ہوگا کہ اس آیت یا سورہ کے نزول کا سبب کیا ہے اور مفہوم اور مقصد کیا ہے تو اس آگاہی کے بعد وہ اس سے تجاوز نہیں کرے گا۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں سے آگاہ نہیں ہوگا تو غور وفکر کے طریقے مختلف ہو جائیں گے۔ نتیجہ میں لوگوں کی راہیں بھی الگ الگ ہو جائیں گی اور علم دین میں عدم رسوخ کے باعث صحیح بات تک پہنچنا ان کے لئے مشکل ہو جائے گا تو ظن و گمان سے کام لیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے

اس بات کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی تخریج ابن وہب نے بکیر سے کی ہے۔ انھوں نے نافعؓ سے پوچھا حروریہ[1] کے بارے

---

[1] حروریہ ان خارجیوں کو کہتے ہیں جو حروراء نامی مقام پر اکٹھے ہوئے اور حضرت علیؓ نے ان سے جنگ کی تھی۔

میں ابن عمرؓ کا کیا خیال تھا تو نافعؒ نے کہا، ابن عمرؓ کے نزدیک یہ لوگ اللہ کی بدترین مخلوق میں سے تھے۔ جو آیتیں کفار کے بارے میں نازل ہوئی تھیں ان کا اطلاق وہ مومنین پر کرنے لگے تھے۔ حضرت نافع کی یہ بات سن کر حضرت سعید بن جبیرؒ بہت زیادہ خوش ہوئے اور کہا، خوارج کا حروری گروہ جن متشابہات کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ: ۴۴)	فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اور پھر اس کے ساتھ سورہ انعام کی یہ آیت ملاتے ہیں:

ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ	پھر بھی وہ لوگ جنھوں نے حق کو ماننے سے انکار
(الانعام: ۱)	کر دیا ہے۔ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔

چنانچہ ان لوگوں کی نگاہ میں جب امام (خلیفہ) کوئی فیصلہ حق کے خلاف کرتا تھا، تو یہ کہتے تھے کہ امام نے کفر کیا اور جس نے کفر کیا اس نے دوسروں کو اللہ کا ہمسر بنا لیا۔ پس یہ امت مشرک ہو گئی ہے۔ پھر یہ لوگ جمع ہوتے اور لوگوں کو قتل کرتے۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے آیت کا غلط مفہوم اخذ کر لیا تھا اور اسی کی طرف ابن عباسؓ نے اشارہ کیا تھا اور اس کا سبب آیتوں کے مفہوم اور سببِ نزول سے عدم آگاہی ہے۔

حضرت نافعؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب حروریوں کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپؓ فرماتے:

یہ مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ ان کی جان اور مال کو حلال سمجھتے ہیں

عدت کے دوران ہی عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ایسی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں جن کے شوہر موجود ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ان لوگوں سے بڑھ کر اور کوئی گردن زدنی کا مستحق نہیں ہے۔

بے بصیرتی کا سبب

ان لوگوں کی اس بے بصیرتی کے اسباب میں اولین سبب یہ ہے کہ یہ لوگ نہ اپنے مخالفوں کی رائے سنتے ہیں اور نہ ان سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی رایوں کا امتحان ایسی جگہ ہو جہاں دوسری رایوں سے ان کا موازنہ کیا جائے اور معاملہ بحث ومباحثہ اور ترجیح کا پیش آجائے۔ اس لئے کہ ان میں اکثر لوگوں نے علم ان لوگوں سے حاصل نہیں کیا ہے جو اپنے اپنے فن میں اساتذہ اور شیوخ شمار کئے جاتے تھے۔ بلکہ ان کا علم کتابوں کے ذاتی مطالعہ تک محدود رہا ہے۔ جہاں غور وفکر، بحث ومباحثہ اور اخذ ورد اور تحلیل و تجزیہ کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے خود ہی ایک چیز پڑھی اور سمجھی اور اسی سے استنباط کرنے لگے اور بسا اوقات ان لوگوں کے مطالعہ، فہم اور استنباط تینوں میں خامی موجود ہوتی ہے لیکن اس کا احساس اور علم نہیں ہوتا۔ اس بات کا بھی امکان ہوتا ہے کہ مخالف کی دلیلیں زیادہ قوی ہوں لیکن انھیں اس کا علم نہیں ہوتا، اس لئے کہ انھیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو مخالف کی ان قوی دلیلوں سے آگاہ کرتا۔ یہ مخلص نوجوان اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ شریعت کا علم اور اس کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے ثقہ اور قابل اعتماد علماء کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ تنِ تنہا اس سمندر کو پار نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو ان

کی دست گیری کرے، شریعت کے غوامض اور مصطلحات سے انھیں آگاہ کرے فروعی مسائل اور نظائر کو ان کے اصول و اشباہ کی طرف لوٹا کر سمجھائے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سمندر کو تنہا تیر کر پار کرنا چاہے اور تیراکی میں ماہر بھی نہ ہو تو یہ اندیشہ بنا رہے گا کہ سمندر کی موجیں اسے اچھال دیں یا اس کا دھارا اسے اس کی منزل سے دور کر دے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمندر اسے نگل لے اور ساحل مقصود پر اسے پہنچنا ہی نصیب نہ ہو اور اسے کوئی بچانے والا بھی نہ ملے۔ اس لئے کہ وہ تنہا ہی اس سمندر میں بغیر کسی مددگار اور رہنما کے اترا تھا۔ اسی طرح شریعت کا مطالعہ بغیر کسی معلم کے آفتوں اور خطروں سے محفوظ نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسے مقامات کا جہاں دلائل کا تعارض بھی ہو، معلم کی رہنمائی کے بغیر حقیقت کیوں کر واضح ہو سکتی ہے؟ اسی لئے علماء سلف اناڑیوں سے علمِ دین کو حاصل کرنے سے خبردار کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے قرآن کی تعلیم مصحفی اور دین کا علم صحفی سے نہ حاصل کرو۔ مصحفی سے ان کی مراد ایسے شخص سے ہوتی جس نے قرآن کو صرف زبانی یاد کرنے پر اکتفا کر لیا ہے۔ شیوخ اور ماہرین قراء سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اسی طرح صحفی سے ان کی مراد ایسا شخص ہوتا تھا جس نے اہلِ علم کی شاگردی اختیار کئے بغیر صرف کتابوں کے مطالعہ پر اکتفا کر لیا ہو۔

علماء سے اعراض کا سبب

یہاں سچی اور انصاف کی بات یہ ہے کہ کچھ نوجوانوں نے صرف کتاب پر اعتماد کیا۔ اس لئے کہ انھیں پیشہ ور علماء، خاص طور سے ان علماء پر جو فرمانرواؤں کے قریب ہوتے ہیں، اعتماد نہ رہا، اس لئے کہ وہ ان حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جن کے فیصلے اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے خلاف ہوتے ہیں اور یہ اسے جانتے بھی ہیں۔ پھر یہ علماء ظالم کو ظالم کہنے سے خاموش رہنے پر اکتفا نہیں

کرتے بلکہ تعریف وتحسین کے کلمات سے اسے نوازتے ہیں۔ آپ بڑے انصاف پرور ہیں۔ آپ بہت ہی عظیم ہیں۔ آپ ہیرو ہیں۔ کاش اگر حق بات کہنے سے یہ لوگ خاموش رہتے ہیں تو باطل کو حق بنانے کی کوشش تو نہ کرتے۔ ایسی حالت میں ان نوجوانوں نے زندوں کے مقابلے میں مُردوں کو زیادہ قابل اعتبار جانا اور بغیر کسی واسطہ کے ان کی کتابوں کی طرف رجوع کیا۔ ان سے استفادہ کرنے لگے۔

ایک بار میں نے ایک نوجوان سے کہا کہ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اہل علم سے علم حاصل کریں اور جو باتیں نہیں جانتے، وہ جاننے والے علماء سے پوچھ لیں۔

اس نوجوان نے کہا، وہ علماء کہاں ہیں جن کے علم اور دین پر ہم اعتماد کریں۔ ہمیں تو ایسا کوئی عالم نہیں ملتا اور جو ملتے ہیں وہ حاکموں کا طواف کرنے والے ہیں یہ حاکم کسی چیز کو حلال بنانا چاہتا ہے تو یہ لوگ اسے حلال بنا دیتے ہیں اور اگر کسی چیز کو وہ حرام قرار دینا چاہتا ہے تو یہ لوگ اسے حرام قرار دے دیتے ہیں۔ اگر حاکم اشتراکیت کو پسند کرتا ہے تو یہ لوگ اشتراکیت کو بابرکت بناتے ہیں اور اس کا نسب نامہ اسلام سے ملا دیتے ہیں اور اگر حاکم وقت سرمایہ داری کو پسند کرتا ہے تو اسلام کے نام پر سرمایہ داری کی تائید شروع کر دیتے ہیں۔ یہ علماء وہی تو ہیں کہ جب ان کے حاکم جنگ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے نزدیک امن اور صلح حرام اور منکر بن جاتا ہے اور جب حکام کی سیاست کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ امن وصلح کے خواں ہوتے ہیں تو یہ ان کی تائید میں فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔

یحلونہ عامًا ویحرمونہ عامًا

ایک سال جس چیز کو حلال قرار دیتے ہیں دوسرے سال اسی کو حرام بنا دیتے ہیں۔

یہ علماء وہی ہیں جو کلیسا اور مسجد کو اسلامی ممالک اور غیر اسلامی ممالک کو یکساں

اور برابر قرار دیتے ہیں۔

میں نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض علماء کی غلطیوں کو ہم سارے علماء پر ڈال دیں اور بروں کی برائی کا نیکو کاروں سے مواخذہ کریں۔ علماء میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے باطل کو ٹھکرا دیا اور ظلم کے سامنے ڈھال بنے رہے۔ علماء میں وہ بھی ہیں جنھوں نے طاغوت کے سامنے جھکنے سے پوری شدت سے انکار کر دیا۔ ترغیب و ترہیب کے ہر ہتھیار کا مقابلہ کیا۔ سزاؤں کو برداشت کیا، دشواریوں کو جھیلا، قید و بند پر راضی رہے، اللہ کی راہ میں جان دے دی، شہید ہو گئے۔ لیکن دین کا سودا نہیں کیا۔ اپنے عقیدہ میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔

نوجوان نے کہا: میں ان باتوں کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن برے علماء ہی آج بڑوں کی صف میں ہیں۔ یہی قائد اور رہنما ہیں، انھیں کے ہاتھوں میں فتویٰ اور رہنمائی کی کنجی ہے۔

بیشک، نوجوان کے ساتھ بڑی حد تک سچائی اور صداقت ہے۔ اب حالت ایسی ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے علماء اقتدار کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور جہاں بولنا ضروری ہوتا ہے اور حق کا چھپانا حرام ہوتا ہے وہاں بھی یہ لوگ اقتدار کے چشم و ابرو کے اشارے پر خاموش رہتے ہیں۔ حالانکہ حق کے تئیں خاموش رہنے والا اور باطل کا اعلان کرنے والا، دونوں کے دونوں شیطان ہیں۔

ایک ملک میں ایک بہت مشہور عالم کو ٹیلی ویژن کی بات چیت میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔ بات چیت کا موضوع تھا، "برتھ کنٹرول اسلامی شریعت کی نگاہ میں"، لیکن ٹیلی ویژن کے ذمہ دار اس وقت حیرت اور دہشت میں پڑ گئے۔ جب اس عالم نے ان سے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں، موضوع کی تائید یا مخالفت؟

مجھے پہلے بتا دیجئے تاکہ اسی لحاظ سے میں تیاری کر لوں۔

اللہ تعالیٰ علمائے سابقین پر رحم فرمائے۔ ایک بار ایک عالم نے ایک پاشا سے کہا، جو اپنا پاؤں پھیلاتا ہے، وہ کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ کاش جب ان لوگوں کے پاس یقین اور تقویٰ کی پونجی کم ہوگئی تو علم اور فہم دین کا سرمایہ ہی بڑھ گیا ہوتا، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔

دین کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے نوجوان ایسے بہت سے علماء سے ملے جو تحریر و تقریر کے آسمان پر جگمگا رہے ہیں۔ لیکن ملنے کے بعد نوجوانوں کو محسوس ہوا کہ ان کے اندر کتاب و سنت کے علم میں کوئی پختگی اور گہرائی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے کوئی روگ اچھا نہیں ہو سکتا اور نہ کسی پیاسے کی پیاس بجھ سکتی ہے ان میں وہ علماء بھی تھے جنھوں نے کسی چلتے ہوئے پرچے میں مضمون لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ حکومت اور رعایا کے مالی معاملات میں سود سود نہیں رہتا اور پھر اپنی دلیل کے بارے میں اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے کہ ان کی دلیل وہ دلیل ہے جس سے پہلے کے علماء قاصر رہے۔ حالانکہ ان کی دلیل ایک قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور بیٹے کے درمیان سود نہیں "لا ربا بین الوالد و ولدہ"، حالانکہ یہ حکم مختلف فیہ ہے، نہ کسی نص سے ثابت ہے نہ اجماع سے۔ پھر اسے اصل مان کر اس پر دوسرے مسائل کا قیاس کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے اور اگر اس پر قیاس کرنا صحیح بھی ہوتا تو یہ قیاس قیاس مع الفارق ہوتا۔

اگر نوجوان اس طرح کے علماء سے مایوس ہو گئے جو علم اور تقویٰ دونوں ہی سے محروم تھے تو اس سلسلے میں نوجوانوں کو معذور ہی سمجھا جائے گا۔ نوجوانوں نے ان علماء میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو موضوع حدیثوں سے استدلال کرتے تھے اور صحیح اور متفق

علیہ حدیثوں کو رد کر دیتے تھے۔ ان علماء میں وہ لوگ بھی تھے جو اسرائیلیات کو دلیل بناتے تھے اور خوابوں سے حجت پکڑتے تھے، ان لوگوں کے پاس کہانیوں اور حکایتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان نوجوانوں نے ان علماء کو بھی دیکھا جو رائج بدعتوں کی تائید کرتے تھے اور ثابت شدہ سنتوں کا انکار کرتے تھے۔ عوام کی خواہشوں اور خواص کی رغبتوں کی ہم نوائی کرتے تھے۔ علم دین کے کسی شعبہ میں انھیں رسوخ حاصل نہیں تھا اسی لئے نوجوان ان سے دور ہوتے گئے اور ان کی طرف سے جو کچھ شائع ہوتا، اس پر نئی نسل اعتماد نہیں کرتی۔

یہاں تک کہ بعض علماء جن کی شہرت نوجوانوں کے حلقہ میں بہت اچھی تھی وہ بھی اقتدار کی تائید کے اس جال میں پھنس گئے جسے ماہر نشر یاتی ذرائع نے نصب کیا تھا، ان علماء نے نوجوانوں کی بات سنے بغیر اور ان کے حقیقی موقف سے آگاہی کے بغیر ان پر شدت پسندی کا الزام عائد کر دیا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے صرف ایک مثال کا پیش کر دینا کافی ہو گا۔ مصر میں نوجوانوں کی اسلامی جماعتوں پر جب پابندی عائد کر دی گئی، ان کی سرگرمیوں کو منجمد کر دیا گیا، بڑی تعداد میں ان کو گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ چلانے کے لئے ان کو عدالت میں پیش کیا گیا، تو ایک مشہور عالم نے کہا:

اگر یہ لوگ سچ مچ اسلام کے مددگار ہوتے تو اللہ انھیں رسوا نہیں کرتا اگر یہ عملاً اسلام کے ناصر و مددگار ہوتے اور اگر اللہ ان کی فکر اور ہدف سے راضی ہوتا تو کوئی طاقت چاہے وہ پولیس کی طاقت ہو یا فوج کی۔ ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ لوگ ایسے نہیں تھے۔ اسی لئے قبل اس کے کہ لوگ انھیں ہزیمت کی منزل پر پہنچاتے اللہ نے پہلے ہی ہزیمت سے دوچار کر دیا۔

اس مشہور عالم نے یہ بات ایک قاعدہ کے طور پر کہی تاکہ اسے حق اور باطل کو معلوم کرنے کے لئے کسوٹی بنا لیا جائے۔ یہ کسوٹی یہ بتاتی ہے کہ جو شکست کھا جائے اور ناکام ہو جائے وہ باطل پر ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ نے اس کی مدد نہیں کی اور جو کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے تو یہ کامیابی اس کے حق پر ہونے کی دلیل ہے لیکن یہ بات شرعاً اور قدراً دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ کامیابی کے لئے کچھ اسباب اور شرائط ہیں۔ کبھی کبھی اہل حق کے پاس ان اسباب اور شرائط کی کمی ہوتی ہے اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی یہ شرائط اور اسباب اہل باطل کے پاس موجود ہوتے ہیں اور وہ ایک طویل یا حقیر مدت کے لئے کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

ہم نے اپنے دور میں یہ دیکھا ہے کہ بہت سے باطل کے علمبردار غالب آ گئے اور کامیاب ہو گئے اور حق کے علمبردار ناکام اور شکست سے دوچار ہوئے اس لئے کہ عالمی طاقتیں پہلے گروپ کے ساتھ تھیں اور حق کے علمبرداروں کے خلاف تھیں ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اسرائیل اس کی واضح مثال ہے۔

ہم میں کون یہ بات نہیں جانتا کہ ترکی قوم اور اس کے علماء اتاترک کی یلغار میں کیسے پیس دیئے گئے؟ اور کس طرح اسلام کو دارالخلافہ سے جلاوطن کر دیا گیا اور بندوق کے زور پر لادینی نظام یا سیکولرزم ترکی قوم پر مسلط کر دیا گیا۔ ان دونوں گروہوں میں کون حق پر اور کون باطل پر تھا؟

ابھی ماضی قریب کی بات ہے بعض مسلم ملکوں میں علماء کو قتل کیا گیا۔ انھیں آگ میں جلا دیا گیا۔ اس لئے کہ اقتدار پرسنل لا کی جگہ پر ایک نیا قانون نافذ کرنا چاہتا تھا لیکن علماء نے اسے چیلنج کیا اور نئے قانون کی مخالفت کی اس لئے کہ یہ نیا قانون

شریعت کے مخالف تھا۔

اللہ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے نئے قانون میں اسے حلال گردانا گیا ہے اور جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے یہ قانون اسے حرام قرار دیتا ہے۔

علمار نے جب اس مخالف شریعت قانون کی مخالفت کی تو اس کی پاداش میں انھیں موت کی سزا دی گئی تاکہ یہ سزا دوسروں کے لئے عبرت بن جائے اور ان کے بعد کوئی دوسرا سر نہ اٹھا سکے اور نہ مخالفت میں کوئی آواز بلند ہو سکے سرکش اقتدار کامیاب ہو گیا۔ علمار کی آواز خاموش ہو گئی۔ قوم پر بھی سکوت طاری ہو گیا۔ تو کیا اقتدار حق پر تھا؟ اور علمار باطل پر تھے؟

ایک اور مسلمان ملک میں جہاں ایک کافر اقلیت مسلم اکثریت پر حکومت کرتی ہے ہزارہا مسلمان مردوں اور عورتوں کو اس نے جیل میں ڈال رکھا ہے تاکہ ہر آواز خاموش ہو جائے، ہر مخالف کمزور پڑ جائے اور کوئی کیوں، کیسے، یہ کیا؟ کہنے والا باقی نہ رہے۔ چہ جائیکہ کوئی ان حکمرانوں کے غلط کاموں پر نکیر کرے اور انھیں ٹوکے۔ اور جب قید خانہ مسلمان قیدیوں سے بھر جاتا ہے تو ان کی تعداد کم کرنے کے لئے مشین گنوں کی گولیاں ان کے سینوں میں پیوست کر دی جاتی ہیں۔ اور پھر جب یہ ظالم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان موت سے ہراساں نہیں ہو رہے ہیں تو انہیں دبانے اور ذلیل کرنے کے لئے ایک ایسا اسلوب اپنایا جاتا ہے۔ جسے چنگیز، ہلاکو اور تاریخ کے دوسرے ظالم اور سرکشوں نے بھی نہیں اپنایا تھا مسلمان قیدیوں کی عزت و ناموس پر ان کی آنکھوں کے سامنے حملہ کیا جاتا ہے۔

بارے الٰہا، کتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا، کتنی عزتیں برباد کی گئیں، کتنے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی گئی ہے، کتنی پرانی مسجدوں کو ڈھادیا گیا ہے، کتنی قیمتی دولت لوٹ لی گئی ؟ کتنے آباد گھروں کو برباد کر دیا گیا؟ شہروں کو باشندوں سمیت ملیا میٹ کر دیا گیا۔ کتنے ہی مرد، عورت اور بچے ملبوں میں دب کر مر گئے، کتنے ہی فرار ہو گئے جنہیں نہ کوئی راہ ملتی ہے نہ کوئی تدبیر سجھائی دیتی ہے۔ اس تباہی و بربادی نے کتنے ہی ایسے کمسن بچوں کو چھوڑا ہے جو کسی کو نہیں پہچانتے اور نہ انھیں کوئی پہچانتا ہے کہ یہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ماں باپ کون ہیں۔

اگر انسان کے دل میں اسلام اور ایمان ہو
تو یہ غم دلوں کو پگھلا دیتا ہے،

طاغوت کے جبروت کے سامنے مسلم قوم مغلوب ہو گئی — تو ان دونوں میں کون حق پر ہے مسلم قوم یا باطل طاقت ؟

تاریخ کے ہر دور میں اس طرح کے حادثات پیش آئے ہیں نواسۂ رسولؐ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما ابن زیاد کی فوج سے شکست کھا گئے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد مدت تک بنی امیہ کی حکومت قائم رہی اور بنو امیہ کے بعد بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ اس پورے دور میں خاندانِ حسینؓ کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں رہا۔ تو کیا اس واقعہ کو دلیل بنا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یزید کی جانب حق تھا اور حضرت حسینؓ باطل پر تھے ؟

پھر اس کے چند سالوں بعد امت کے عالم، بہادر قائد عبداللہ بن الزبیرؓ حجاج کی فوج سے شکست کھا گئے۔ جب کہ حجاز اور اس کے ملحقہ علاقوں میں

چند سالوں تک انھیں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی حیثیت حاصل رہی

پھر اس کے بعد اس بپھرے ہوئے سرکش فرمانروا نے عبدالرحمٰن بن الاشعث اور ان کے ساتھ دوسرے بڑے علماء کو مثلاً سعید بن جبیرؒ، مطرف بن عبداللہ کو پیس کر رکھ دیا، نیز ان میں سے کچھ کو قتل کرا دیا۔ مثلاً سعید بن جبیرؒ۔ انہیں کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"سعیدؒ کو قتل کر دیا گیا۔ جب کہ روئے زمین پر کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔"

تو کیا حجاج کے طوفان کے سامنے ان بزرگوں کی پسپائی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ باطل پر تھے اور حجاج حق پر تھا؟

اس موقع پر ہمیں ان مسلمان بزرگوں کی باتیں یاد آرہی ہیں جنھوں نے مخالفوں کے سامنے ایک معرکہ میں حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ خدا کی قسم اگر ہمیں درندے نوچ ڈالیں یا پرندے اچک لیں تب بھی ہمیں اس بات میں شک تک نہیں ہو سکتا کہ تم باطل پر ہو اور ہم حق پر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ جب اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں محصور ہو گئے تھے تو فرمایا:

بخدا اگر حق کے خلاف ساری دنیا کے لوگ صف بستہ ہو جائیں تو حق ذلیل نہیں ہو گا اور اگر باطل کی پیشانی پر چاند چمکنے لگے تب بھی باطل عزت والا نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک نے یہ بات بیان کی ہے کہ کچھ نبیوں کو ان کے دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ

(البقرہ ۸۷)

پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا، تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا،

ان قتل ہونے والے نبیوں میں زکریا علیہ السلام اور ان کے پاک باز بیٹے یحییٰ علیہ السلام ہیں تو کیا ان انبیاء کا قتل ہو جانا اور ان کے دشمنوں کا ان پر قابو پالینا، اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ اپنی دعوت اور پیام میں حق پر نہیں تھے؟

قرآن پاک میں ہم اصحاب اخدود کا واقعہ بھی پڑھتے ہیں۔ ان لوگوں نے لمبے گڑھے کھود کر اس میں آگ کے شعلوں کو بھڑکایا اور مومنین کے ایک گروہ کو اس میں جھونک دیا اور خود گڑھے کے کنارے بیٹھے ہوئے اس المناک منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، آگ کے شعلوں کو دیکھ رہے تھے اور وہ سچے مومنوں کو نگلتی جا رہی تھی۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ

(البروج ۸)

اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔

تو کیا یہ باغی اور سرکش حق پر تھے، اس لئے کہ ان لوگوں نے کمزور مومنین پر قابو پالیا تھا اور انھیں تباہ و برباد کر دیا اور ان کا نام و نشان بھی نہیں چھوڑا؟ اور کیا یہ مومنین باطل پر تھے، اس لئے کہ ان کا انجام اس دنیا میں تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا؟

حقیقت یہ ہے کہ عالم مذکور کا استدلال ہر حال میں نا قابل قبول ہے، میں نہیں جانتا کہ اس عالم نے اللہ کی اس سنّت (قانون) کو کیوں بھلا دیا کہ وہ مومنین کی آزمائش کرتا ہے اور کبھی کبھی باغیوں اور سرکشوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ

الم، کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

(العنکبوت ۱-۳)

غزوہ احد کی پسپائی کے بعد اللہ تعالیٰ کا مومنین کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ . . .

(آل عمران ۱۴۰)

اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے یہ زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اسلئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں

اسی طرح دوسروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ

(القلم ۴۳-۴۴)

. . . ہم ایسے طریقہ سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسّی دراز کر رہا ہوں میری چال بڑی زبردست ہے

جہالت اور بے بصیرتی

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا سبب دین میں بے بصیرتی، تاریخی معلومات کی کمی اور حیات و کائنات کے سلسلہ میں سنن الٰہی سے عدم آگاہی ہے۔ چنانچہ اس روگ میں مبتلا افراد میں سے کسی کو آپ دیکھیں گے کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانا چاہتا ہے، اور ایسی چیز کا طلب گار بنتا ہے جو پائی نہیں جاتی اور تخیل کی اس دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس کا اس عالم آب و گل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ واقعات کو غیر حقیقی رنگ میں دیکھتا ہے اور ان کی تفسیر و تشریح ان اوہام کی بنیاد پر کرتا ہے جن کا اس کے سر میں ڈیرہ ہوتا ہے۔ ان اوہام کی بنیاد نہ سنن الٰہی پر ہوتی ہے نہ شرعی احکام پر، وہ چاہتا ہے کہ پورے سماج کو بدل دے، اس کے افکار اور جذبات کو، اس کے عادات و اخلاق کو، اس کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کو وہمی وسائل اور خیالی اسلوب کے سہارے بدل دے، اس کام کے لئے پوری بہادری، جرأت اور فداکاری کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی قربانی کو زیادہ نہیں سمجھتا اور نہ موت کی پرواہ کرتا ہے کہ اس کا شکار وہ خود ہوتا ہے یا کوئی اور، نہ اسے نتائج کی پرواہ ہوتی، وہ دیکھتا ہے کہ اگر نیتوں میں اخلاص ہے اور ہدف اعلاء کلمۃ اللہ ہے تو نتیجہ کچھ بھی نکلے کوئی پرواہ نہیں۔ اگر یہ لوگ سیرت نبوی میں غور و فکر کرتے تو انھیں معلوم ہوجاتا کہ تیرہ سال تک رسول اللہ صلعم لوگوں کو مکہ میں اسلام کی طرف بلاتے رہے ــ اور ان کی تربیت کرتے رہے اور چاروں طرف دائیں بائیں شرک کا خیمہ گڑا ہوا تھا خانہ کعبہ ۳۶۰ بتوں کے گھیرے میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے تھے، اس کا طواف کرتے تھے اور چاروں طرف یہ بت

موجود ہوتے تھے۔ لیکن آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے کبھی یہ نہیں سوچا
کہ ایک فدائی حملہ کر کے انھیں چکنا چور کر دیا جائے اور ان سے چھٹکارا حاصل
کر لیا جائے، اس لئے کہ اگر آپؐ ایسا کرتے تو اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو
ہلاکت اور بربادی سے دوچار کر دیتے۔ اس لئے کہ دونوں گروہوں میں
طاقت کا توازن نہیں تھا۔ اس طرح تباہی جو ہوتی وہ تو ہوتی ہی، بُت پرستی
بھی اپنی جگہ پر قائم رہتی، بُت پرست ان بتوں کی جگہ پر گھڑ کر یا خرید کر
دوسرے بتوں کو پھر دوسرے دن نصب کر دیتے۔ اس لئے کہ بُت پرستی
پہلے ان کے ذہنوں میں قائم ہوئی تھی پھر بعد میں اسے مرئی روپ ملا،
ایسی حالت میں جب تک ان کے ذہن اس جھوٹ سے آزاد نہ ہوتے تو بتوں کی
توڑ پھوڑ سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟

یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ابتدا میں کعبہ کے اندر اور باہر بُتوں سے
تعرض کئے بغیر دعوت اسلامی کی اشاعت میں مشغول ہو گئے، آپؐ نے کوشش
کی کہ توحید کے اجالے سے دل و دماغ روشن ہو جائیں۔ گمراہی کی بیڑیاں کٹ
جائیں۔ تقویٰ سے دل پاک و صاف ہو جائیں اور ناخدا پرست طاقتیں جو اہلِ
ایمان کا صفایا کر دینا چاہتی تھیں، انھیں خاک و خون میں لت پت دیکھنا
چاہتی تھیں ان سے ایک فیصلہ کن معرکہ کے لئے مومنوں کی ایک صف تیار
ہو جائے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کو ایمان و صبر کی تربیت دینے لگے تاکہ سرکش
وثنیت کے ساتھ آنے والے معرکہ میں ان کی سانس اکھڑنے نہ جائے، جس کا
پیش آنا امر یقینی تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں مارا پیٹا جاتا تھا

وہ زخموں سے چور چور آپؐ کے پاس آتے تھے اور آپؐ سے درخواست کرتے تھے کہ آپؐ انھیں جنگ کی اجازت دے دیں تاکہ وہ اپنی تلواریں میان سے نکال لیں اور اپنی مدافعت میں دشمنوں کا مقابلہ کریں، ان سے جنگ کریں، لیکن آپؐ انھیں اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ انھیں حکم دیتے تھے کہ صبر کریں اور ہاتھوں کو روکے رکھیں تاآنکہ اللہ تعالیٰ جنگ کرنے کی اجازت دے دے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم حضرت عمارؓ اور ان کے والدینؓ کے پاس سے گزرے، ان کی ابتلاء و آزمائش دیکھ کر آپؐ بے قرار ہو گئے، فرمایا اے یاسرؓ کے خاندان والو! صبر کرو، تمہارے لئے جنّت کا وعدہ ہے۔ ابتلاء اور آزمائش کے یہ حالات برقرار رہے، یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی تاکہ وہ اپنے دفاع اور اپنی دعوت کی آزادی کے لئے دشمنوں کا مقابلہ کرسکیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دئے گئے صرف اس تصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" (الحج - ۳۹)

دعوت اسلامی کا یہی وہ موڑ ہے جہاں وثنیت کے سرکش علم برداروں سے مسلّح تصادم کی نوبت آئی، تلوار تلوار سے ٹکرائی اور قوت کا قوت سے مقابلہ کیا گیا۔

لیکن یہ باتیں کب پیش آئیں، یہ باتیں اس وقت پیش آئیں، جب آنحضرت صلعم اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو ایک ٹھکانہ مل گیا اور ان کا وجود

ایک حقیقت بن گیا اور ان کے ہاتھ میں ایک گونہ طاقت بھی آگئی، پھر غزوات اور سرایا کا سلسلہ شروع ہوا، فتح عظیم حاصل ہوئی، مکہ میں جہاں سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی تھی فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے، اپنے نیزے کی انی سے آپ نے خانہ کعبہ میں نصب بتوں کو زمین پر گرادیا اور آپ کی زبان مبارک پر قرآن پاک کی یہ آیت تھی۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (الاسراء - ۹۱)

اور اعلان کردو کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔"

تاریخ کے سلسلہ میں سب سے عجیب وغریب چیز جو میں نے پڑھی اور سنی ہے، وہ اس جماعت کی قیادت کا موقف ہے جسے عام لوگ جماعۃ التکفیر والہجرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جسے اس جماعت کے لوگ جماعت المسلمین کہتے ہیں۔ جناب استاذ عبدالرحمن ابوالخیر اس جماعت کے لئے گھر کے شاہد کی حیثیت رکھتے موصوف نے "یادایام" میں جماعت کے بانی الشیخ شکری سے اپنے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے اس موقف کی نشاندہی کی ہے کہ ان کے نزدیک تاریخی واقعات نہ کسی توجہ اور اہتمام کے مستحق ہیں اور نہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ قرآن میں ان کا ذکر محض احسن القصص کے طور پر آیا ہے، لہذا خلافت اسلامی کے دور کا مطالعہ کرنے کا اہتمام کرنا حرام ہے۔

دیکھئے۔ اللہ آپ کی نگہبانی کرے۔ یہ کیسی سطحیت ہے یہ کیسی تنگ نظری ہے جو مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ کو دینی لحاظ سے حرام قرار دے دیتی ہے حالانکہ تاریخ عبرتوں کا خزانہ اور قوموں کا معلم ہے، جس طرح ایک فرد کل کے واقعات سے آئندہ کے لئے سبق حاصل کرتا ہے، اسی طرح قومیں بھی اپنے ماضی

سے اپنے مستقبل کو سنوارنے کا سبق سیکھتی ہیں اور اپنے صحیح اور غلط کاموں سے اور اپنی فتح و شکست سے عبرت حاصل کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں بیدار مغز قوم کے لئے تاریخ یادداشت اور قوت حافظہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جو قوم اپنی تاریخ کو نظر انداز کر دیتی ہے اس کی حیثیت اس فرد کی طرح ہو جاتی ہے جس کی یادداشت کی قوت ختم ہو گئی ہو اور جو صرف آج کیلئے جیتا ہے، وہ اپنے ماضی کو نہیں جانتا اور نہ اس کے پس منظر میں اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا پراگندہ حال انسان ہے جو اپنی بنیاد سے محروم ہو کر اپنے حال کا مرثیہ خواں بن گیا ہے۔ ایسے فرد کی شدید ترین ضرورت یہ ہے کہ اس کا علاج کیا جائے، تاکہ اس کی قوت حافظہ پھر اسے واپس مل جائے، پھر جب یہ کیفیت ایک فرد کے لئے درست نہیں ہو سکتی تو ایک گروہ یا جماعت کے لئے اسے کیوں کر درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں کائنات اور انسانی سماج کے لئے سنن الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے اسی لئے قرآن کریم نے اس پہلو پر پوری توجہ دی ہے اور دل و دماغ اور فکر و نظر کے سامنے پورے اہتمام سے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے تاکہ سنن الٰہی سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان سے عملی درس حاصل کیا جائے۔

آیئے آپ بھی میرے ساتھ قرآن پاک کی درج ذیل آیتوں کو پڑھئے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (آل عمران - ۱۳۷)	تم سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان کا انجام کیا ہوا جنہوں نے اللہ کے احکام و ہدایات کو جھٹلایا۔

یہ سنن الٰہی ثبات کی حامل ہیں ان میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا انکے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا، یہ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے لگے اور بری بری چالیں چلنے لگے، حالاں کہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں اب کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے، یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے (فاطر-۴۲، ۴۳)

جس طرح سنن الٰہی کو ثبات اور دوام حاصل ہے اور کبھی بھی ان میں تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی، اسی طرح انھیں عمومیت بھی حاصل ہے اور ان کا انطباق سارے انسانوں پر ہوتا ہے چاہے وہ کسی دین کے ماننے والے ہوں اور کسی قوم و وطن سے تعلق رکھتے ہوں، جو سماج بھی غلطی کرے گا اور راہ راست سے بھٹکے گا، اسے اپنی غلطی اور انحراف کے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا، خواہ وہ سماج صحابہ کرام اور نبی صلعم ہی کا کیوں نہ ہو، اس سلسلہ میں صحابہؓ نے غزوہ احد کے موقع پر اپنی بھول کی جو بھاری قیمت ادا کی ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ

(آل عمران - ۱۶۵)

اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبیؐ ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔

ایک دوسری آیت میں عند انفسکم کی وضاحت کی گئی ہے۔

... حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ ....

مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا (آل عمران - ۱۵۲)

اب رہی یہ بات کہ تاریخ غیر ثابت شدہ واقعات کا نام ہے تو یہ بات بعض جزوی واقعات پر تو صادق آسکتی ہے لیکن یہ عام قاعدہ اور اصول نہیں ہے تاریخ کے اہم اور معروف بنیادی حیثیت کے واقعات جن کے ثبوت کے لئے ایک سے زائد دلیلیں ہیں ان پر اس قاعدہ کا اطلاق کیونکر ہوسکتا ہے اب رہے وہ بعض جزوی واقعات جن کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں تو تاریخ سے باخبر حضرات کے لئے ان کی چھان بین کوئی دشوار کام نہیں ہے وہ کھرے اور کھوٹے کا پتہ لگا سکتے ہیں اور یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے، کتنا حصہ درست ہے اور کتنا جعلی اور بناوٹی ہے یا اس میں کتنا مبالغہ پایا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ تاریخ سے ہماری مراد صرف مسلمانوں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ معلوم ومعروف انسانی تاریخ ہے، قوموں کی تاریخ ہے، چاہے ان کا تعلق کسی سرزمین یا کسی

زمانے سے ہو، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ عبرت صرف مسلمانوں ہی کی زندگی سے نہیں حاصل کی جاتی بلکہ یہ مومن اور کافر، نیک و بد سب ہی سے حاصل کی جاتی ہے اس لئے کہ دونوں ہی فریقوں پر سنن الٰہی یکساں طور پر جاری ہوتی ہے، سنن الٰہی میں کسی کے لئے جانبداری نہیں پائی جاتی، اس باب میں یہ طبعی قوانین کے مانند ہیں، حرارت اور برودت ابالنے اور پگھلانے، دباؤ اور دھماکہ کے قوانین طبعی اور کونی قوانین کے مانند ہیں، ان کا اثر موحد اور مشرک پر یکساں ہوتا ہے۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کو جس طرح سمجھنا چاہیئے ہم اس طرح نہیں سمجھ سکتے اور نہ اسلام کی عظمت کو پوری طرح جان سکتے ہیں جب تک کہ ہم جاہلیت اور اس کی گمراہیوں کو نہ جان لیں۔ جس کی طرف قرآن پاک نے اشارہ کیا ہے۔

... وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ — حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ (آل عمران ۱۶۴)

... وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ... (آل عمران: ۱۰۳) — تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔

اور حضرت عمرؓ نے اسی حقیقت کا اعلان اس طرح کیا:

انما تنقض عری الاسلام عروۃ عروۃ اذا نشأ فی الاسلام من لایعرف الجاھلیۃ — جب اسلام میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو جاہلیت سے آگاہ نہ ہوں گے تو اسلام میں انتشار اور بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

اگر حقیقت کا اعتراف فضیلت کی بات ہے تو میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ جو لوگ اسلام اور دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت میں لگے ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر لوگوں نے تاریخ نہیں پڑھی ہے اگرچہ ان لوگوں نے غالی حضرات

کی طرح، تاریخ کے مطالعہ کو نہ اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے نہ اپنے پیروکاروں پر، لیکن پھر بھی ان لوگوں نے غور و فکر اور حاضر ذہنی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، تاریخی واقعات کو ایک تسلسل کے ساتھ پڑھ لینا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ ان کی روح اور مغز تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، ان سے عبرت حاصل کی جائے اور ان میں جاری سنن الٰہی سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہم نہیں ہے کہ کوئی آدمی دنیا کی سیاحت کرے اور سر کی آنکھوں اور کانوں سے آثار قدیمہ کا مشاہدہ کرے اور ان کے بارے میں باتیں سنے بلکہ یہاں اہمیت دل کی نگاہوں اور کانوں کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ (الحج ۴۶)

تاریخی حادثات اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں ان میں بڑی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے اس لئے کہ ان کے پیچھے اٹل قوانین ہیں۔ یہی قوانین ان حادثات کے لئے محرک کا کام دیتے ہیں، یہی ان کی صورت گری کرتے ہیں، اسی لئے مغربی مفکرین نے کہا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اسی حقیقت کا اظہار عربی زبان کے اس محاورہ "آج کی رات کل کی رات سے کتنی مشابہ ہے" سے بھی ہوتا ہے۔

یکساں تصورات اور افکار سے پیدا ہونے والے اقوال و اعمال اور مواقف

میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کی طرف قرآن پاک میں اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی ؟ ایسی باتیں ان سے پہلے کے لوگ بھی کیا کرتے تھے ان سب (اگلے پچھلے گمراہوں) کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ (البقرہ ۱۱۸)

مشرکین قریش کے بارے میں ارشاد ہے :

كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ أَتَوَاصَوْا بِهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ

(الذاریات ۵۲-۵۳)

یوں ہی ہوتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی ایسا رسول نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنوں۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے ؟ نہیں ! بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

اللہ کے رسولوں کے سلسلہ میں اگلے اور پچھلے ہر دور کے مشرکین کے موقف میں جو مشابہت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور جس طرح ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر رسولوں پر سحر اور جنون کی تہمت لگائی، ان میں سے کسی چیز کا ظہور اس لئے نہیں ہوا کہ یہ لوگ آپس میں اس کے لئے ایک دوسرے کو وصیت اور نصیحت کرتے رہے ہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سب لوگ ظالم اور سرکش تھے۔ پھر جب سبب یعنی سرکشی میں مشابہت پیدا ہو گئی ہے تو نتائج کے ظہور میں بھی مشابہت کا پایا جانا ضروری ہو گیا۔

جو شخص تاریخ اور اس میں کارفرما سنن الٰہی سے آگاہی رکھتا ہے، سوچنے

سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے دوسروں کی غلطیوں سے کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنے لئے تاریخی واقعات میں عبرت و نصیحت کا سامان پالیتا ہے، خوش بخت انسان وہی ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے اور ان کے پاس جو بھلائیاں ہیں ان سے دامن بھرنے کی کوشش کرے۔ دانائی کی بات مومن کی گمشدہ دولت ہے، جہاں سے بھی ملے وہ اسے حاصل کرنے کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

قانون فطرت یا سنن الٰہی کی دو اہم دفعات

پرجوش اور جلد باز افراد اپنے جوش و خروش اور جلد بازی کے باعث سنن الٰہی کی دو اہم دفعات نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان سے غفلت برتنے لگتے ہیں یہ دونوں اہم دفعات یہ ہیں:

۱۔ قانون تدریج

۲۔ قانون اجل مسمّٰی

قانون تدریج اس کا تعلق طبعی امور سے بھی ہے اور تشریعی امور سے بھی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی تخلیق چھ دن میں کی حالانکہ وہ اس بات پر قادر تھا کہ کُن کہہ کر ان کو آن کی آن میں پردہ عدم سے نکال کر وجود کا لباس پہنا دیتا۔ لیکن ایسا نہ کر کے اس نے زمین و آسمان کی تخلیق اپنے دنوں کے حساب سے چھ دن میں کی، اسے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تخلیق چھ مرحلوں یا چھ زمانی دوروں میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ چھ دن ہمارے دنوں کی طرح نہیں تھے اس لئے کہ یہ زمین اور سورج کی پیدائش اور رات دن کی گردش سے پہلے کی بات ہے۔

تدریج کا یہی قانون ہم انسانوں، جانوروں اور پودوں کی طبعی زندگی میں بھی دیکھتے، ان میں سے ہر وجود تدریجی مراحل سے گزر کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

اب رہی بات تشریعی امور کی تو قانون تدریج کی جھلک یہاں بھی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اسلام کا آغاز توحید کی دعوت سے ہوا۔ صحیح عقائد سے دل و دماغ کی دنیا روشن کی گئی پھر دھیرے دھیرے ایک تدریج سے فرائض و محرمات سے متعلق آیات کا نزول ہوا، جیسا کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کو فرض اور شراب وغیرہ کو حرام قرار دینے والی آیات سے واضح ہوتا ہے۔ یہی چیز مدنی سورتوں کو مکی سورتوں سے ممتاز اور الگ کرتی ہے۔

تشریعی امور میں تدریج کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں

"قرآن پاک میں پہلے پہل صرف وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنّت اور جہنّم کا ذکر ہے یہاں تک جب لوگ اسلام کے سایہ میں آگئے تو حرام اور حلال کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اور اگر پہلے ہی مرحلے میں وہ آیتیں نازل ہوتیں جن میں شراب اور زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے تو لوگ کہہ اٹھتے۔ ہم شراب اور زنا کو کبھی نہیں چھوڑیں گے" (البخاری)

اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ از سر نو اسلامی زندگی کو اپنانے کی دعوت دے رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام کی فرماں روائی قائم ہو تو ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہدف تک پہنچنے کے سلسلہ میں تدریج کے قانون کو نگاہوں کے سامنے رکھیں۔ ہدف کی عظمت، امکانات اور رکاوٹوں کی کثرت کے پیش نظر بھی اس سے اعراض صحیح نہیں ہوگا۔

اس موقع پر مجھے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے، حضرت عمر نے سررشتہ کار اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد خلفائے اربعہ کے

نقشِ قدم پر چلنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کے نوجوان، غیور اور پرجوش بیٹے عبدالملک نے جب یہ دیکھا کہ غلطیوں کو درست کرنے اور مظالم کے ہٹانے اور زندگی کے قافلہ کو خلفائے راشدین کی راہ پر لگانے میں تاخیر ہو رہی ہے تو ایک دن اپنے والد عمر بن عبدالعزیز سے کہا:

"آپ سارے معاملات کو جلد از جلد درست کیوں نہیں کر دیتے حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے ہمیں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے"

بیٹے کی بات سن کر مومن اور فقیہ باپ نے جواب دیا:

"بیٹے جلدی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دو بار شراب کی مذمت میں آیتیں اتاریں اور تیسری بار اترنے والی آیتوں میں اسے حرام قرار دیا گیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں تدریج کو نظر انداز کر کے یک بارگی لوگوں کو پورے حق پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں تو کہیں لوگ اسے چھوڑ نہ دیں، تو یہ بھی بڑا فتنہ ہو گا"

(الموافقات ۲/۹۴)

قانون اجل مسمی

ہر چیز اور کام کے لئے ایک وقت متعین اور مقرر ہے۔ قانون تدریج کے لئے یہ تکمیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر چیز کے لئے جو وقت مقرر ہے اس میں اسے پختگی اور کمال حاصل ہوتا ہے، نیز اس کا تعلق مادی اور غیر مادی ہر چیز سے ہے اس "اجل مسمی" کو نظر انداز کر کے جو چیز حاصل کی جاتی ہے اس سے متوقع فائدے حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ کھیتی کو اگر کٹائی کے وقت سے پہلے کاٹ لیا جائے یا پھلوں کو وقت سے پہلے ہی توڑ لیا جائے تو کبھی کبھی یہ چیزیں فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔

پھر جب اسی قانون اجل مسمی کے تحت ہم یہ دیکھتے کہ پودوں سے ان کا پھل چند مہینوں یا پورے سال میں حاصل ہوتا ہے اور بعض درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو کئی کئی سال بعد پھل دیتے ہیں تو ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ کچھ عظیم اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا پھل کئی دہائیوں کے بعد ہی سامنے آسکتا ہے جو کام جتنا بڑا ہوگا اس کا نتیجہ یا پھل اتنی ہی دیر سے سامنے آئے گا۔ جو ڈول زیادہ بھرا ہوتا تو اسے نکالنے میں خالی یا ہلکے ڈول کے مقابلہ میں زیادہ وقت اور محنت درکار ہوتی ہے، نیز کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نسل بنیادی نوعیت کا کوئی اہم کام شروع کرتی ہے لیکن اس سے وہ خود فائدہ نہیں اٹھا پاتی بلکہ دوسری یا تیسری یا بعد میں آنے والی نسلیں اس سے فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے جب تک کہ ہر چیز اپنی سیدھی اور مقرر راہ پر چل رہی ہے۔

مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مذاق اڑاتے تھے اور جب آپؐ یہ کہتے تھے کہ

"آپؐ کا اور آپؐ پر ایمان لے آنے والوں کا انجام بہتر ہوگا اور جو لوگ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوں گے۔ تو مشرکینِ مکہ تمسخر کے انداز میں کہتے تھے کہ یہ عذاب ہم پر جلد از جلد کیوں نہیں آجاتا، اور اس بات کو فراموش کر دیتے تھے کہ کارخانۂ قدرت میں ہر چیز کے لئے ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔"

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ

یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آچکا ہوتا اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آکر رہے گا اچانک اس حال میں کہ انھیں خبر بھی نہ ہوگی (العنکبوت ۵۳)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ

یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں، اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے (الحج ۴۷)

اسی لئے اللہ نے اپنے رسولؐ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کے اس سلوک پر اسی طرح صبر کا رویہ اپنائیں جس طرح آپ سے پہلے اولوالعزم انبیاءؑ نے صبر کا رویہ اپنایا تھا اور یہ نہ چاہیں کہ ان لوگوں کو عذاب الٰہی جلد از جلد اپنی گرفت میں لے لے، حالانکہ یہ ناعاقبت اندیش اپنے لئے یہی چاہ رہے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف ۳۵)

پس اے نبی صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے آپؐ اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کے سامنے انبیاء سابقین کی زندگیوں کو نمونہ کے طور پر پیش کیا کہ کس طرح اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے کامیابی کے انتظار کی مشکل گھڑیوں کو کاٹا، دعوت و تبلیغ کی راہ میں شدید ترین آزمائشوں سے گذرے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

(البقرہ: ۲۱۴)

ہاں! اللہ کی مدد قریب ہے، لیکن اس کے لئے ایک وقت مقرر ہے، ایک "اجل مسمی" ہے اور کسی کے چاہنے سے اس میں کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ اسی لئے آں حضرت صلعم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صبر کی نصیحت کرتے رہتے تھے اور ان کی تربیت کرتے تھے کہ کامیابی اور فتح کے لئے جلدی نہ کریں اس کے ظہور کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔

حضرت خباب بن الارت رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، اے اللہ کے رسول، اسلام کی راہ میں ہمیں ستایا جا رہا ہے۔ شدید ترین ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں، کیا آپ ہمارے لئے دعا نہیں کریں گے؟ کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد نہیں چاہیں گے ——؟ آپ کی یہ شکایت سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک غصّہ سے سرخ ہو گیا اور آپؐ اٹھ بیٹھے اور فرمایا:

تم سے پہلے وہ لوگ گذرے ہیں، جن کی ہڈیوں سے گوشت اور پٹھوں کو لوہے کی کنگھیوں سے چھیل دیا گیا۔ یا پھر ان میں کسی کو آری سے دو ٹکڑوں میں چیر دیا گیا۔ وہ لوگ ان تکلیفوں کو برداشت کرتے تھے لیکن اپنے دین سے منحرف نہیں ہوتے تھے۔ پھر اللہ اس دین کو غالب کر کے رہے گا یہاں تک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا لیکن اسے راہ میں خدا کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوگا، البتہ اسے اپنی بھیڑ بکریوں کے سلسلہ میں بھیڑیوں سے اندیشہ ہوگا یہ سب کچھ ہو کر رہے گا لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو۔

دیارِ اسلام میں اسلام کی غربت

یہاں ایک اور سبب بھی ہے۔ جس کا اس زمانہ

میں دین دار مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کی نفسیات پر اثر پڑ رہا ہے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ منکر کا اعلان ہو رہا ہے، بگاڑ پھیل رہا ہے باطل مسرور اور سرفراز ہو رہا ہے سیکولرزم پورے زور و شور سے مصروف گویائی ہے، مارکسیت بغیر کسی شرم و حیا کے لوگوں کو بلا رہی ہے، صلیبیت بغیر کسی خوف کے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نقشہ بنا رہی ہے اور اس پر عمل کر رہی ہے۔ ذرائع نشر و اشاعت سے بے حیائیوں کا پرچار ہو رہا ہے، برائیاں پھیلائی جا رہی ہیں، عورتیں لباس بے لباسی میں دعوت نظارہ دے رہی ہیں اور خود ہی شکار بن رہی ہیں، شراب کھلے عام پی جا رہی ہے۔ کلبوں اور برائی کے اڈوں نے رات کو بھی دن بنا لیا ہے۔ جذبات کو بھڑکانے کے لئے عریاں ادب، فحش لٹریچر، ننگی تصویروں، عریاں فلموں، ناٹکوں اور ڈراموں کی تجارت ہو رہی ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں لوگوں کو فسق و فجور اور معصیت پر ابھارتی ہیں۔ اسلام اور ایمان کی راہ میں روک بنتی ہیں۔

ایک دین دار مسلمان کو یہ ساری چیزیں دیار اسلام میں نظر آتی ہیں اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ قانون سازی جسے امت کے عقائد اور اخلاقی اقدار کا مظہر ہونا چاہئے نیز قانون کے روپ میں اسے امت کی روحانی اقدار کی حفاظت کرنی چاہئے اور محروسات میں دراندازی کرنے والوں کو سزا دینی چاہئے لیکن افسوس کہ آج یہ قانون سازی منکر کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ بگاڑ کی تائید کر رہی ہے اس لئے کہ اس قانون سازی کا منبع اللہ کی نازل کردہ وحی نہیں بلکہ لوگوں کے بنائے ہوئے اصول ہیں، پھر ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال بنایا جا رہا ہے اور جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا اسے حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ فرائض ساقط کئے جا رہے ہیں اور حدودِ الٰہی کو معطل کیا جا رہا ہے۔

پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جن حکام پر اللہ تعالیٰ نے مسلمان قوموں کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ ایک ایسی راہ پر چل رہے ہیں جو اسلام کی راہ نہیں ہے، اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہیں اور اللہ کے دوستوں سے دشمنی۔ اللہ نے جن لوگوں کو دور کر دیا ہے یہ لوگ ان کو اپنے سے قریب کرتے ہیں اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے قرب کے شرف سے نوازا ہے انہیں یہ لوگ دور رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا ہے انہیں یہ لوگ آگے آگے رکھتے ہیں اور جو لوگ اسلام کو آگے رکھتے ہیں، انہیں یہ لوگ پیچھے ڈال دیتے ہیں، اسلام کی یاد انہیں دینی تقریبات اور عیدوں ہی کے موقع پر آتی ہے اور وہ بھی اپنی اپنی قوموں کو حقیقت حال سے بے خبر رکھنے کے لئے۔

یہاں اس بگاڑ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ کھلا ہوا اجتماعی ظلم۔ بھیانک طبقاتی تضاد، چند افراد تو لاکھوں اور کروڑوں میں کھیلتے ہیں لیکن جمہور کی جیب پانچ اور دس پیسے سے بھی خالی رہتی ہے، ایسے محلوں کی تعمیر پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے جو پورے سال خالی پڑے رہتے ہیں یا پورے سال میں چند دن کے لئے یہ اپنے مکینوں سے آباد ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب کہ کروڑوں افراد کھلی جگہوں میں آسمان کی چھت کے نیچے موت سے ہم کنار ہوتے رہتے ہیں۔ سردی اور گرمی سے بچنے کے لئے نہ انہیں کسی چھت کا سایہ میسّر ہے نہ کسی دیوار کی آڑ، یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے خزانے سونے سے اسی طرح بھرپور نظر آتے ہیں جس طرح تنور شعلوں سے۔ بیرونی ملکوں کے بنکوں میں ان کے کھاتے ہوتے ہیں۔ ان کھاتوں کے نمبر بھی خفیہ اور راز ہوتے ہیں۔ ان بنکوں میں ان کی کتنی پونجی جمع ہے صرف اللہ جانتا ہے یا نامہ اعمال لکھنے والے فرشتے جانتے ہیں یا بنکوں کے وہ کلرک جانتے ہیں جو بنکوں میں حساب کتاب لکھتے ہیں لیکن عام لوگوں کے پاس اس طرح کا کوئی خزانہ نہ

نہیں ہے، ان کا خزانہ تو بس ان کی جیب ہے جس پر افلاس کا سایہ رہتا ہے، یہ قلیل مقدار پر قانع رہتے ہیں لیکن کبھی یہ مقدار بھی حاصل نہیں ہوتی، بچے بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں۔ بزرگ کرب و الم میں مبتلا رہتے ہیں لیکن دال روٹی کا نظم نہیں ہو پاتا، حالانکہ اگر کوئی مالدار، کوئی سرمایہ دار، عالمی کمپنیوں کا کوئی ایجنٹ ایک سودا میں جتنا کماتا ہے، ایک رات میں جوئے میں جتنا سرمایہ ہار جاتا ہے یا انگور زادی کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے اگر وہی رقم وہ غریبوں کی امداد کے لئے دیدے تو بہت سے غریبوں کی تہی دستی ختم ہو جائے اور بہت بڑی تعداد میں بھوکوں اور ننگوں کے لئے کھانا اور کپڑا مہیا ہو جائے۔

کیوں نہیں ... بڑی بڑی رقمیں لوٹ لی جاتی ہیں۔ قوم کے سرمایہ کو چرایا نہیں بلکہ غصب کر لیا جاتا ہے۔ رشوت کا بازار کھلا ہوا ہے۔ نگرانی کا شعبہ کیل کانٹے سے لیس ہے لیکن بڑے بڑے چور آزادی اور عزت کی نعمت سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، البتہ چھوٹے چھوٹے چور سخت سے سخت سزاؤں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اس ظلم و جور کے نتیجہ میں افراد اور گروہوں کے باہمی تعلقات میں بغض اور حسد کا زہر بڑھتا جا رہا ہے، یہ بغض و حسد قلبی تعلقات اور اچھے روابط کو تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح وبائی امراض میں انسانی جسم تباہ و برباد ہو جاتا ہے، تخریبی نظریات کے علم بردار اس فضا اور ماحول سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے تناقضات کو اپنے مفاد میں استعمال کر کے طبقاتی کش مکش اور اجتماعی بغض کے شعلوں کو بھڑکانے میں لگے رہتے ہیں اس طرح اپنے درآمدی دین (اشتراکیت) کی نشر و اشاعت کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں۔ اسی فضا میں ان لوگوں کو ایسے افراد ملتے ہیں جو ان کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ نیا مذہب ان کا مطلوب و مقصود ہے،

بلکہ حالات حاضرہ سے ان کی بے زاری اس کا سبب ہوتی ہے۔ اور یہ ساری باتیں اس لئے ہوتی ہیں کہ اسلام اپنی آفاقیت اور اپنے کمال اور توازن کے ساتھ۔ میدان سے غائب ہے۔ اپنے وطن میں پردیسی اور اپنوں میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ حکومت اور قانون سازی سے الگ کر دیا گیا ہے۔ عمومی رہنمائی کے میدان سے اسے ہٹا دیا گیا ہے۔ حکومت کے سیاسی، اقتصادی اور تمام داخلی اور خارجی معاملات سے الگ تھلگ کر دیا گیا ہے، اسلام پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ وہ انسان اور خدا کے نجی تعلقات کے دائرہ میں اپنے آپ کو محصور رکھے اور اجتماعی، دستوری اور سرکاری تعلقات کے دائرے میں در آنے کی جسارت نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ انحطاط کے دور میں نصرانیت کی جو شکل وصورت تھی اسلام کو بھی اپنی شکل وصورت ویسی ہی بنا لینی چاہیئے یعنی اسلام عقیدہ ہو شریعت کے بغیر، عبادت ہو معاملات کے بغیر، دین ہو حکومت کے بغیر، قرآن ہو طاقت کے بغیر، گویا اسلام پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ پر دوسروں کے تاریخی بوجھ کو اٹھائے جس کا تعلق نہ امت مسلمہ سے ہے نہ عالم اسلام سے، نیز اس کا تعلق ایسے ظروف واحوال سے ہے جو اسلام کے لئے بالکل اجنبی ہے۔

یورپ میں کیتھولک کلیسا کی تاریخ المناک واقعات اور سلبی امور سے اٹی پڑی ہے کیتھولک کلیسا نے علم کے مقابلہ میں جہل، آزادی کے مقابلہ میں استبداد، قوموں اور کمزور طبقوں کے مقابلہ میں شاہوں اور جاگیرداروں کی حمایت کی، کلیسا کی تفتیشی عدالتوں کے حکم سے سائنس دانوں اور جدید فکر کے علم برداروں کو سزائیں دی گئیں، انہیں زندہ جلا دیا گیا اور کبھی ان کی لاشوں کو جلایا گیا۔ دین کے نام پر ظلم اور تاریکی کو سماج پر مسلط کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ مسیحی عوام نے کلیسا کے خلاف بغاوت کر کے اس کی سرکشی سے نجات اور اس کے اقتدار سے آزادی حاصل

کرئی لیکن اسلام کا کیا تصور ہے ؟ کہ کلیسا کی تاریخ کا یہ بوجھ اس پر لادا جا رہا ہے اور یہ فیصلہ صادر کیا جا رہا ہے کہ اسلام کو امت مسلمہ کی قیادت سے الگ تھلگ کر دیا جائے اور قانون سازی، رہنمائی اور اثر و نفوذ کے ہر مقام سے اسے ہٹا دیا جائے اور دلوں کے پوشیدہ گوشوں میں اسے محبوس کر دیا جائے اور اگر سینوں سے باہر آئے تو مسجدوں اور خانقاہوں کی چہار دیواری کے اندر رہے، نیز مسجد میں بھی اسے اپنی زبان پر قابو رکھنا ہوگا اور اپنی آواز کو پست کرنا ہوگا اور اس محاورہ کو ہمیشہ یاد رکھنا ہوگا۔ اپنی حد کے اندر رہو، اسی میں تمہاری خوش بختی ہے اور اسے نہ بھولو۔ یہ مسجد ہے نگرانی کی خوردبین کے نیچے ہے۔ اسے نہ تبلیغ کی آزادی ہے نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔

اس دشواری کی روح یہ ہے کہ اسلامی سماج پر سیکولرزم کو فرض قرار دیدیا گیا ہے حالانکہ یہ چیز اسلام کے لئے اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ اسلامی اقدار اور ورثہ سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ سیکولرزم کا حاصل یہی تو ہے کہ دین کو اسٹیٹ سے الگ کر دیا جائے۔ حکومت اور قانون سازی سے دور کر دیا جائے لیکن اسلام کے لئے یہ چیز بالکل اجنبی اور انجانی ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ اس تصور سے خالی ہے ——— اسلام کی پوری تاریخ میں شریعت ہی فتویٰ اور فیصلہ کی اساس اور بنیاد رہی ہے۔ اسلام ہی تو عبادات کا، معاملات کا، آداب کا اور باہمی تعلقات کی بنیادوں کا منبع اور سوتا رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں کچھ ایسے حاکم اور شہری بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کی پیروی کی اور ہدایت ربانی اور دین حق سے انحراف کی راہ اپنائی لیکن ایسا کوئی بھی نہیں ہوا ہے، جس نے اسلام کے اس پہلو کا انکار کیا ہو کہ مخاصمتوں اور مخالفتوں کو طے کرنے کے لئے اسلام ایک شریعت بھی ہے، یہاں تک کہ

حجاج بن یوسف وغیرہ جابر حکمرانوں کو شرعی احکام کی طرف توجہ دلائی جاتی، کتاب و سنّت کی نصوص ان کے سامنے پیش کی جاتیں تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے:

صدق اللہ و رسولہ، سمعنا و اطعنا، غفرانک ربنا و الیک المصیر

اللہ اور اس کے رسول کا ارشاد سچا ہے ہم نے اسے سنا اور اطاعت کی، پروردگار ہم تیری مغفرت کے طلب گار ہیں اور تیرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے

شریعت کی پابندی میں خواہش نفس، حسد، غصہ، غفلت یا اور کسی سبب سے کوتاہی کرنا اور بات ہے اور اس کو منجمد بنا دینا، اس کا اعتراف نہ کرنا، اس کی سیادت کو تسلیم نہ کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے، شریعت کا یہ حق ہے کہ اس کے فیصلے صادر ہوں۔ اس لئے کہ وہ کلام الٰہی اور حکم الٰہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (المائدہ - ۵۰)

حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلے کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ یہ الجھن مسلمانوں کی نئی نسل کے جذبات سے ٹکراتی ہے اس کے دل و دماغ کو بے چین کر دیتی ہے۔ نئی نسل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں اپنے آپ کو اپنے عقائد اور اپنے فلسفہ حیات کے سانچے میں ڈھال رہی ہیں، دین کے بارے میں، کائنات کے بارے میں، اللہ اور انسان کے بارے میں ان کے جو تصورات ہیں اسی کی چھاپ وہ اپنی زندگیوں پر ڈال رہی ہیں لیکن مسلم قوم کے لئے فرض قرار دیدیا گیا کہ وہ اپنی پوری زندگی عقیدہ اور حالات، دین اور سماج کے درمیان کشمکش میں گزارے۔

مسیحی سماج میں سیکولرزم کو قبولیت حاصل ہو گئی، لیکن اسلامی سماج میں اس نظریہ کو کبھی بھی عام قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی، مسیحیت کے پاس نہ کوئی شریعت

ہے، نہ نظامِ حیات جس کی پابندی ہر مسیحی پر واجب ہو بلکہ انجیل خود ہی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ زندگی کا ایک حصّہ دین اور اللہ کے لئے ہے، دوسرا حصّہ قیصر اور اسٹیٹ کے لئے ہے، انجیل کا ارشاد ہے :

جو قیصر کا ہے قیصر کو دے دو اور جو اللہ کا ہے اللہ کو دے دو۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مسیحی کے لئے لادینی یا سیکولر حکومت کے تحت زندگی گذارنا آسان ہوتا ہے، اس کا ضمیر مطمئن رہتا ہے اور اسے اپنے عقیدہ میں کوئی خراش محسوس نہیں ہوتی۔

اسی طرح یورپ کے مسیحی باشندوں کے لئے دینی حکومت کو چھوڑ کر سیکولر حکومت کو اپنانے کے لئے ایک عذر موجود ہے۔ دینی حکومت کو ان لوگوں نے کاہنوں اور کلیسا کی حکومت کے روپ میں دیکھا ہے، جہاں سے کسی کے لئے دنیا میں انسانی حقوق اور آخرت میں جنّت سے محرومی کا فرمان صادر ہوتا تھا تو کسی کے لئے مغفرت کا پروانہ ملتا تھا۔

لیکن جب ہم مسلم سماج پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سیکولرزم کو قبول کرنے کا مفہوم کچھ اور ہے، اس لئے کہ اسلام عقیدہ اور شریعت بھی ہے اور مکمل نظامِ حیات بھی، ایسی حالت میں سیکولرزم کو قبول کرنے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی شریعت کا تعلق زندگی سے ختم کر دیا جائے۔ احکامِ الٰہی کو ردّ کر دیا جائے اور اسلامی شریعت پر یہ تہمت لگائی جائے کہ وہ اس زمانہ میں زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اور انسان کو اپنی عقل کے سہارے اپنے لئے خود قانون بنانا چاہئے اور اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ بھی ہے کہ انسان کے محدود علم اور ناقص تجربوں کو ہدایتِ الٰہی پر ترجیح اور فضیلت دی جائے۔

قل أ أنتم اعلم ام الله کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟

اسی لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلم سماج میں سیکولرزم کی دعوت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ الحاد کی دعوت دی جائے، اسلام سے فرار اور علیحدگی کی دعوت دی جائے اور اسلامی شریعت کے بدلے میں سیکولرزم کو حکومت کی بنیاد بنانا امت کا اس دین سے صریحاً ارتداد ہے جسے اللہ نے پسند کیا تھا کہ وہ امت کا دین ہو اور جسے خود امت اسلامیہ نے بھی اپنے لئے پسند کیا تھا نیز امت پر یہ بات فرض قرار دی گئی تھی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے کرے، ایسی حالت میں اس عظیم منکر پر قوم کا سکوت اختیار کرنا دین کی کھلی مخالفت اور معصیت ہے اور اس کا واضح ترین نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ان سے گناہ کا ارتکاب ہوا ہے زندگی کی اس ساخت کو دل ناپسند کرتا۔ اسے نہ قلبی رضا حاصل ہوتی ہے نہ احترام اس لئے کہ یہ ایسی ساخت ہوتی ہے جسے مسلم کی نگاہ میں آئینی اور دستوری حیثیت حاصل نہیں ہے۔

مزید برآں سیکولرزم مغرب کے اس فکر سے پوری طرح ہم آہنگی رکھتا ہے کہ اللہ نے یہ دنیا پیدا کی ... اور پھر اسے چھوڑ دیا، اب دنیا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت وہی ہے جو گھڑی کے ساتھ گھڑی ساز کے تعلق کی ہوتی ہے۔ گھڑی ساز نے پہلی بار گھڑی بنا کر اسے چھوڑ دیا کہ وہ وقت کا چکر کاٹتی رہے اور گھڑی ساز سے اس کی کوئی حاجت وابستہ نہ رہے۔ سوچ سمجھ کا یہ اسلوب یونان اور خاص طور سے ارسطو کے فلسفہ کی وراثت ہے۔ ارسطو کے نزدیک دنیا کا خالق دنیا کے کسی معاملہ کے نظم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اسے تو دنیا کی کسی چیز کے بارے میں کوئی علم بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بقول "ول ڈیورانت" کے یہ بہت ہی مسکین خدا ہے، ایسا مسکین اور بے خبر خدا لوگوں کو

ان کے حال پر نہ چھوڑے گا تو اور کیا کرے گا؟ بھلا وہ ان کے لئے قانون کیسے بنا سکتا ہے جب کہ وہ ان کے حالات و معاملات کو جانتا ہی نہیں۔ اس کے برخلاف ہم مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کا خالق ہے، اس پوری کائنات کا فرماں روا اور حاکم ہے۔ تمام امور کا نظم اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس کے علم نے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اس کے علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر چیز اس کے شمار میں ہے، ہر چیز پر اس کی رحمت چھائی ہوئی ہے، ہر زندہ وجود کو وہی روزی دے رہا ہے۔ اسی لئے اس نے شریعت نازل کی حلال و حرام کو متعین کر دیا اور اپنے بندوں پر یہ فرض کر دیا کہ شریعت کی پابندی کریں اور اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے کریں، کفر، ظلم اور فسق کی راہ نہ اپنائیں۔

ایک دین دار مسلمان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہاتھوں سے چھوکر محسوس کرتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مقابلہ کے لئے کیا کرے، امر و نہی کے سلسلہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اسے کوئی اختیار نہیں، وہ منکرات کو اپنے ہاتھ سے مٹا نہیں سکتا، اپنی زبان سے اسے مٹانے کے خیال کا اظہار نہیں کر سکتا اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ منکر کو اپنے دل میں منکر سمجھے اور یہی ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے، یہی سب سے کمزور ایمان ہے۔ دل سے منکر کو منکر سمجھنے کا یہ مفہوم ہے کہ سینے میں دل اسی طرح کھولے جس طرح دیگچی چولہے پر کھولتی ہے اور منکرات کو دیکھ کر حسرت و غم سے قلب کی سوزش بڑھتی جائے، اور منکرات کے سلسلے میں اپنی اس بے بسی پر۔ اس کے دل کو اس طرح گھل جانا چاہئے جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے ـــ یہ سوز درون ہمیشہ سینے میں دبا کر نہیں رکھا جا سکتا کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی صورت میں اس کا اظہار ہو کر رہے گا۔ ہانڈی کے نیچے آگ زیادہ ہوتی ہے تو اُبال آجاتا ہے یا ہانڈی

ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

امت مسلمہ کے خلاف کھلی یلغار اور خفیہ سازشیں

اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سامنے رکھئے کہ ماضی اور حال میں پوری دنیائے اسلام کو مشرق و مغرب، شمال اور جنوب میں کن کن یلغاروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسلم ملکوں پر، ان کے مقدس مقامات پر وحشیانہ حملے کئے جا رہے ہیں، مسلمانوں کے خلاف ایک ایسی جنگ چھیڑ دی گئی ہے جس کے شعلے بجھنے کا نام نہیں لے رہے ہیں، اس جنگ کے شعلوں کو کبھی علانیہ بھڑکایا جاتا ہے اور کبھی خفیہ طور سے، یہ ایک ایسی جنگ ہے جس پر ساری غیر مسلم، یہودی، صلیبی، اشتراکی اور وثنی طاقتیں متفق اور متحد ہیں اگرچہ یہ طاقتیں بعض مسائل میں ایک دوسرے سے پورا پورا اختلاف رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں انھیں یہ محسوس ہوتا کہ دعوت، تحریک یا اسٹیٹ کے روپ میں اسلام کی لہر ابھر رہی ہے تو اسے دبانے کے لئے یہ ساری طاقتیں پورے طور پر متحد و متفق ہو جاتی ہیں۔

دونوں بڑی طاقتوں، روس اور امریکہ کے باہمی تضاد کے باعث دنیا کے ہر مسئلہ کو مادی اور اخلاقی تائید ملتی رہتی ہے لیکن اسلام کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جسے حقیقی عملی تائید کہیں سے حاصل نہیں ہوتی۔ نہ روسی کیمپ سے نہ امریکی کیمپ سے، نہ مشرق سے، نہ مغرب سے، کیا ہی سچا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کا:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ

جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں (الانفال: ۷۳)

ایک مسلمان جو اسلامی اخوت اور بھائی چارہ پر یقین رکھتا ہے اور اس نسبت پر فخر کرتا ہے کہ اس کا تعلق خیر امت سے ہے جو سارے لوگوں کے لئے اٹھائی گئی ہے،

وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ سارے مسلمان، وطن اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک امّت اور دوسروں کے مقابلہ میں ایک ملّی وجود ہیں اور وہ اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ جو مسلمان مسلمانوں کے مسائل پر توجہ نہیں دیتا، نہ ان کے حل کے لئے کوئی اہتمام کرتا ہے وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ ہر جگہ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی دیکھے اور یہ دیکھے کہ اس کے دینی بھائیوں کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ انہیں قتل کیا جارہا ہے، سزائیں دی جارہی ہیں، انہیں مسیحی اور کمیونسٹ بنا کر ان کے معنوی وجود کو ختم کیا جارہا ہے۔ انہیں گمراہ بنانے اور دین سے جاہل رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور وہ اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کرے، چہرہ مسکراتا رہے۔ اطمینان کی نیند سوئے، ہر صبح و شام، خوشی و مسرت کی صبح و شام بنی رہے، اگر ایسا ہو تو ایمانی اخوت اور رشتہ اسلام کہاں ہے؟

فلسطین، لبنان، افغانستان، فلپائن، اریٹریا، صومالیہ، قبرص وغیرہ سے رات دن، صبح و شام مسلمانوں کے بارے میں ایسی خبریں آتی رہتی ہیں جو غیرت مند مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ حسرت و یاس سے ان کا دل خون ہو جاتا ہے رنج و الم کے تیر ان کے قلب و جگر کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے ملک کی حکومتیں مظلوم مسلمانوں کے مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دے رہی ہیں بلکہ ان کا رویہ اعراض کا رویّہ ہوتا ہے۔ خبروں پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ علاقائی، نسلی رشتوں اور عسکری روابط و معاہدات کے تحت وہ مسلم دشمن طاقتوں سے کندھا ملا کر کھڑی ہو جاتی ہیں اس طرح علاقائی مصلحتوں، جاہلی نسلی رشتوں اور مختلف فوجی کیمپوں کی وفاداریاں، اللہ اور رسول اور دین و ملّت کی وفاداری پر غالب آجاتی ہیں اور مسلمانوں کے مسائل سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔

اسی طرح مسلم نوجوان رات دن یہ پڑھتے اور سُنتے رہتے ہیں کہ مسلم مسائل کے تئیں ان کے ملکوں کا سلبی موقف خود ان کا اپنا اختیار کردہ موقف نہیں ہے بلکہ یہ موقف ملک سے باہر رہنے والی اسلام دشمن طاقتوں نے طے کیا ہے، رہے ملک کے حکام تو یہ صہیونیت یا عالمی صلبیت یا اشتراکیت کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں — یہی طاقتیں پس پردہ رہ کر انھیں حرکت دیتی رہتی ہیں۔ یہی انھیں اسلامی تحریکوں سے خوف زدہ کرتی رہتی ہیں۔ یہی انھیں ابھارتی ہیں کہ ان تحریکوں کا قلع قمع کر دیں اور پھر یہ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

گزشتہ سالوں میں جس مسئلہ نے مسلم نوجوانوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے وہ ۵ جون ۱۹۶۷ء کی عظیم مصیبت ہے جو مسلمانوں کے اوّلین اور اہم ترین مسئلہ، مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں اسرائیل کی جارحانہ یلغار کی صورت میں سامنے آئی۔ اور جسے ہلکا کرنے کے لئے پسپائی کا نام دیا گیا۔

مسلمان نوجوان کو ہمیشہ یہی بات بتلائی گئی کہ اسرائیل ایک طفیلی اور اجنبی وجود ہے اس کا قیام جارحیت اور غصب کی بنیاد پر عمل میں آیا ہے۔ سرزمین اسلام کو اس مغربی جرثومہ کے اثر سے آزاد کرانا دینی فریضہ ہے یہ امتِ مسلمہ کے جسم کے لئے بیماری کے جراثیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسرائیل کو کسی ایسی زمین پر جو اس کی اپنی نہ ہو باقی رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جیسا کہ فلسطین کے مفتی اکبر الحاج امین الحسینی رحمۃ اللہ نے کہا تھا فلسطین ایسا ملک نہیں ہے جو اپنی قوم سے محروم ہو کہ اس محرومی کو دور کرنے کے لئے وہ ایسی قوم کا استقبال کرے جس کا اپنا کوئی ملک نہ ہو۔

پھر زمانہ نے ایک کروٹ لی اور ۱۹۶۷ء کا المیہ پیش آیا۔ اس المیہ کے بعد عرب سیاست دانوں نے ایک نئی راہ اپنائی۔ جس کی منزل اور غایت یہ مقرر کی گئی کہ ۱۹۶۷ء

کی حالیہ جارحیت کے نشان مٹا دئے جائیں، یہ ایک طرح سے اسرائیل کے وجود کا اعتراف تھا اور ۵ر جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی جارحیت کو صحیح تسلیم کر لیا گیا تھا، گویا اس نئی جارحیت نے قدیم جارحیت کو قانونی لباس عطا کر دیا، اور جب پھر یہی سب کچھ کرنا تھا تو ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء میں جنگ کیوں لڑی گئی؟ کیوں نہیں اسرائیل کو تقسیم کے وقت ہی تسلیم کر لیا گیا، اس طرح امت مسلمہ کو جنگ کی مصیبتوں، تباہیوں اور نقصانات سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔

اور پھر پُرامن حل اور سلامتی کے معاہدہ کے پس پردہ وہ کوششیں شروع ہوئیں جس نے آرزوؤں اور تمناؤں کو ملیامیٹ کر دیا، نوجوانوں کے جوش و جذبہ اور امنگ کو تباہ و برباد کر دیا، اس کے جواز کی باتیں کرنے والے چاہے کتنی ہی باتیں کرتے رہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ معاہدہ عسکری، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی لحاظ سے مسلم نوجوان کیلئے ایک انتہائی زبردست چوٹ تھی، اس صدمہ نے ان کی آرزوؤں کو پامال کر دیا۔ یہ صدمہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے واضح حق کے ہوتے ہوئے دنیا کی ساری بڑی طاقتیں اسرائیل کے باقی رہنے کی تائید اور حمایت کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں مسلم نوجوان جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ صلیبی جنگ ہے ایک نئے روپ میں۔ واقعات سے ان کے اس فکر کی تائید بھی ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ احساس اور شعور نئی مسلم نسل پر اثر انداز ہو رہا ہے مسلم نوجوانوں کا یہ احساس رہا ہے کہ صلیبی جنگ کا جذبہ آج تک مغرب کے سیاست دانوں اور رہنماؤں کے لئے محرک بنا ہوا ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کے تئیں ان کے اندر جو بغض و عناد پیدا ہوا تھا اس کا اثر آج تک باقی ہے اسلامی

تحریکوں اور مسلم ملکوں کے سلسلہ میں ان کے رویہ، پالیسی اور نقطۂ نظر میں اس کی جھلک صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔

اس سلسلہ میں مشرق کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ ایک مدت تک شک میں پڑا رہا اور دوسروں کے اندر بھی شک وشبہ پیدا کرتا رہا کہ "مغرب کے اندر آج بھی صلیبی روح موجود ہے"۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مفادات ہی مغرب کے لئے محرک اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی مفادات ان کے سیاسی اور عسکری فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ان کی خوش گمانیوں کا قلعہ تھوڑے ہی دنوں میں زمیں بوس ہو گیا، میں آج لبنی' اور 'غزرو' کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اپنے ہم عصروں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مغربی دنیا آج تک اسرائیل کے ساتھ کیوں کھڑی ہے؟ اور کیوں بار بار اور زور دے کر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اسرائیل کو اس لئے وجود دیا گیا ہے تاکہ وہ باقی رہے؟ سلامتی کونسل میں جب جب اسرائیل کی مذمت کی قرارداد منظور ہوتی ہے تو امریکہ ویٹو کا استعمال کر کے پوری دنیا کو چیلنج کیوں دیتا ہے؟ اریٹریا کی مخالفت میں حبشہ کی مدد کیوں کی جاتی ہے؟ مشرق اور مغرب کے دور دراز گوشوں میں کسی جہاز کا اغوا ہو جائے یا کسی سیاسی شخصیت کا اغوا ہو جائے یا مشرق و مغرب کے کسی شہر میں کوئی انفرادی حادثہ ہو جائے تو زمین و آسمان کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے مسائل کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے ان پر پردہ ڈالنے کی کیوں کوشش ہوتی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون ہی کیوں سب سے سستا خون بنا ہوا ہے؟

بے شک یہ خوفناک جہنمی ثالوث ہے۔ امت مسلمہ کے خلاف اس کی سازش جاری رہتی ہے جس طرح کھانے کے دستر خوان پر لوگوں کو دعوت دے کر بلایا جاتا ہے اسی طرح یہ ثالوث اپنی طاقتوں کو مسلمانوں کے خلاف بلاتا ہے کہ مل کر اور متحد ہو کر مسلمانوں کا قلع

جمع کردیں۔ یہ ثالوث، یہودیت، صلیبیت اور شیوعیت کا ثالوث ہے۔ یہ تینوں گروہ ہم مسلمانوں کے وجود کے خلاف متحد ہو گئے ہیں، غنیمت کی تقسیم پر ان تینوں نے اتفاق کر لیا اور یہ بھی طے کر لیا ہے کہ مالی بوجھ ہم پر ہو گا، تاوان ہمیں دینا ہو گا بلکہ یہاں تک طے کر لیا ہے کہ یہ طاقتیں قصاب کا کردار ادا کریں گی اور ہم ذبیحہ ہوں گے۔

اب رہے ہمارے حکام تو نوجوانوں کی نگاہ میں شطرنج کی بساط کے مہرے ہیں اور دنیا پر حکمران یہ "خفیہ طاقتیں" انھیں حرکت دیتی رہتی ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں۔ یہ آئے دن کے انقلابات اور تبدیلیاں جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ انھیں طاقتوں کا کھیل ہے جسے یہ سیاسی اسٹیج پر کھیلتی رہتی ہیں اور کسی بزدل کو سورما بنا کر دکھاتی ہیں کہ جنگ وقتال کر رہا ہے آگے بڑھ رہا ہے۔ پیچھے ہٹ رہا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بزدل نہ سورما ہوتا ہے، نہ جنگ کے داؤ پیچ سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ یہ جو کچھ ہوتا ہے دھوکا دینے کے لئے ایک سیاسی ڈرامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ان باتوں میں کچھ مبالغہ بھی پایا جاتا ہو لیکن یقینی طور پر اس میں کچھ سچائی بھی ہے، مختلف موقعوں پر جو موقف اور پالیسی اپنائی جاتی ہے اس سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور یہی وہ بات ہے جس نے بہت سے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ اسلامی بیداری کو ناکام بنانے اور تحریک اسلامی پر ضرب لگانے کی سازش میں ہمارے حکام اسلام دشمنوں کے ساتھ شریک ہیں تاکہ اسلام کا قافلہ نہ اپنی منزل پا سکے اور نہ دعوت اسلامی برگ و بار لا سکے۔ یہ حکام نوجوانوں کی نگاہ میں قوم و وطن کے ایسے رہنما ہیں جو اپنے وطن کے لئے غیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن بباطن یہ کرایے کے ایجنٹ ہیں۔ ان کا حملہ اپنی قوم کے دین پر ہوتا ہے اور ان کی تگ و دو دشمنوں کے فائدہ کیلئے

ہوتی ہے۔

دعوتِ اسلامی کی راہ میں دشواریاں

یہاں ایک سبب اور بھی ہے جس سے آگاہ کرنا ضروری ہے، اس کا تعلق دعوت وتبلیغ کی آزادی سے ہے یہ واضح حقیقت ہے کہ اسلام مسلمانوں سے صرف یہی نہیں چاہتا کہ وہ اپنی ذات کی حد تک نیک اور صالح بن جائیں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی کوشش کریں،

اسی بات کا ثبوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تواصی بالحق، تواصی بالصبر اور دعوت الی الخیر کے فریضہ سے بھی ملتا ہے، اسلام کی نگاہ میں ہر مسلمان اس بات کا مکلّف ہے کہ وہ اپنی طاقت اور وسائل کے مطابق دین کی دعوت کا کام انجام دے، اللہ نے ہر مسلمان کو اس کا مکلف بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ (النحل: ۱۲۵) "اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو" کے مخاطب تمام مسلمان ہیں ہر شخص جو اللہ کے رسول کی اتباع کرتا ہے وہ داعی الی اللہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ (یوسف ۱۰۸)

کہہ دو میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بصیرت کی روشنی میں بلاتا ہوں اور میری اتباع کرنے والے بھی۔

اسی لئے مصلحین اور مجددین کا یہ شعار رہا ہے کہ: اپنے نفس کی اصلاح کرو اور دعوت اسلامی کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

اسلام کی نگاہ میں یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے انفرادی عمل پر اکتفا کرلیں، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے، ایک مومن دوسرے مومن کے لئے اس دیوار کی مانند ہوتا ہے جس کا ہر جز دوسرے جز سے وابستہ ہوتا ہے۔ تنہا آدمی کمزور اور قلیل ہوتا ہے لیکن اپنے بھائیوں سے مل کر وہ کثیر اور طاقتور ہو جاتا ہے نیکی اور تقویٰ کے سلسلہ میں تعاون ایک دینی فریضہ اور زندگی کی ضرورت ہے۔ پھر اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ اجتماعی طور سے دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت بھی ایک شرعی واجب ہے۔ اس لئے کہ جس چیز پر کسی واجب کی تکمیل موقوف ہوتی ہے تو وہ چیز بھی واجب ہی ہوتی ہے۔

اس وجوب کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی کہ اسلام مخالف طاقتیں منظم ڈھنگ سے اپنے عقائد اور نظریات کی نشر و اشاعت میں لگی ہوئی ہیں۔ پھر تو یہ ضروری ہے کہ ان اجتماعی کوششوں کا جواب اجتماعی کوششوں سے دیا جائے اور ان ہی کے اسلوب میں دیا جائے، ورنہ ہم کچھ نہ کرسکیں گے۔ ہمارا شمار قافلہ سے پیچھے رہ جانے والوں میں ہوگا اور دوسرے آگے بڑھ جائیں گے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے بڑا گناہ جس کا ارتکاب بعض مسلم حکومتیں کر رہی ہیں وہ یہ ہے کہ ان حکومتوں نے تبلیغ اسلام کی آزادی سلب کرلی اور جو لوگ لوگوں کو صحیح اسلام کی طرف بلاتے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ ہے، ایک نظام حیات ہے اور اس بات کے لئے کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہو، شریعت کا نفاذ ہو، امت مسلمہ میں اتحاد پیدا ہو، اسلامی ممالک آزاد ہوں ـــ دنیائے اسلام کے مسائل حل ہوں۔ ان لوگوں کی راہ میں یہ حکومتیں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

دعوت اسلامی اور مبلّغین اسلام پر یہ دباؤ اور اسلامی سرگرمیوں پر پابندی وہ

نمایاں اور اہم سبب ہے جو لوگوں کو شدت پسندی کی طرف لے جاتا ہے خصوصاً جب لوگ یہ دیکھتے کہ دوسرے فلسفوں اور خود ساختہ مذاہب کو پوری آزادی حاصل ہے، ہر طرح کا انھیں تعاون مل رہا ہے اور ان کی سرگرمیاں بغیر کسی رکاوٹ اور دباؤ کے رواں دواں ہیں۔

یہ کوئی معقول اور پسندیدہ بات نہیں ہے کہ اسلام کی سرزمین پر سیکولرزم مارکسیت . . . وغیرہ مذہبوں، فلسفوں اور نظام حیات کے داعیوں اور مبلّغوں کو تو کھلی چھوٹ حاصل ہو۔ ان کی جماعتیں اور تنظیمیں قائم ہوں، ان کے رسالے اور اخبارات نکل رہے ہوں لیکن تنہا اسلام پہ پابندی لگادی جائے جب کہ وہی اس گھر کا مالک ہے اور اسلام کے دعاۃ اور مبلغین کے منہ بند کر دئے جائیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ یہی لوگ سوادِ اعظم کے جذبات، امّت کے عقائد اور اس کی قدر و قیمت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کیا یہ پسندیدہ بات ہے کہ چمن میں ہر زاغ و زغن کو نغمہ سرائی کا حق حاصل ہو، لیکن عندلیب خوش نوا اس حق سے محروم ہو۔

کامل اور مثبت اسلام ــ عقیدہ اور نظام حیات کی دعوت کئی مسلم ملکوں میں ضبط شدہ اور ممنوعہ سامان بن گیا ہے۔ اور جس مانوس اسلام کی اجازت ہے وہ درویشوں اور دین کی تجارت کرنے والوں کا اسلام ہے پس ماندگی اور انحطاط کے دور کی مختلف تقریبوں کا اسلام ہے جو سرکشوں اور طاغیوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ان کے لئے درازئ عمر کی دعا کرتا ہے۔ اعتقاد میں جبریوں، عبادت میں خرافیوں کا اسلام ہے، اخلاق میں سلبیت اور فکر میں جمود اس کی نشانی ہے۔ یہ وہ اسلام ہے جس میں چھلکوں پر توجہ دی جاتی ہے لیکن روح اور مغز کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یہی وہ اسلام ہے جس کی اجازت ہے اور جسے ظالم فرماں رواؤں اور حکام کی تائید اور عنایت بھی حاصل ہے، یہاں تک کہ ان میں جو فرماں روا لادینیت اور سیکولرزم کے

علم بردار ہیں وہ بھی بڑھ چڑھ کر اس کا احترام کرتے ہیں اور اسے بابرکت گردانتے ہیں اس کے ماننے والوں کی عزت کرتے ہیں، اس کے مبلّغین کی تعظیم کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ مغلوب قوموں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کو اسی کے نشہ میں مست رکھیں اور نوجوانوں کو اپنی بلیغ کاریوں، رموز و مصطلحات اور رسوم و رواج کے سمندر میں اس طرح غرق کر دیں کہ ان کے اندر سے طاغوت کے خلاف جہاد کی روح سرد پڑ جائے اور ظلم کو پسپا کرنے، منکر اور برائیوں کو مٹانے کے لئے ان کے اندر کوئی جذبہ نہ رہے۔ غالباً یہی وہ بات تھی جس کے باعث مارکس اور اس کے مکتبۂ فکر کے لوگوں نے کہا کہ "دین تو قوموں کے لئے "افیون" ہے۔

اب رہی بات حقیقی اور اصلی اسلام کی، کتاب و سنت کے اسلام کی، صحابہ رضو اور تابعین کے اسلام کی، حق اور قوت کے اسلام کی، عزت و عظمت کے اسلام کی، جود و سخا اور جہاد کے اسلام کی۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ اسلام اصحاب اقتدار کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلام۔ حاکموں کے ظلم اور ظلم کرنے والوں کی حکومت کے خلاف اپنے اندر انقلاب اور بغاوت کی روح رکھتا ہے اور اپنے ماننے والوں کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے دلوں میں خدا کے علاوہ کسی اور کا خوف نہ ہو اور نہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور سے ڈریں۔

وَالَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (الاحزاب: ۳۹)

(یہ اللہ کی سنت ان لوگوں کے لئے ہے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ رازق ایک ہے، عمر ایک ہے، رب ایک ہے اسی ذات پاک پر اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے پھر ایسی حالت میں اس کے علاوہ کسی اور کے خوف کی گنجائش کہاں ہے؟ ایک مسلمان ملک جو کئی سو سال تک اسلامی خلافت کا مرکز رہا ہے وہیں کے ایک قومی رہنما کو جو نائب وزیر اعظم کے منصب پر فائز تھے وزارت سے الگ کر کے جیل

بھیج دیا گیا، نیز ان برادران کے رفقاء اور ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا کہ یہ لوگ اسلام کے مبلغ ہیں اور شریعت کی حکمرانی چاہتے ہیں۔ یہ جرم اس ملک میں عائد کیا گیا جس کی ۹۹ فی صد آبادی مسلمان ہے اور اسلام کو اپنا دین مانتی ہے، مدعی (سرکار) کی طرف سے ان لوگوں پر ۱۵ جرم عائد کئے گئے تھے لیکن ہر ایک کا محور و مرکز ایک ہی تھا کہ یہ لوگ ترکی کو اسلام مخالف لادینی اسٹیٹ سے بدل کر ایک ایسی اسٹیٹ بنا دینا چاہتے ہیں جو اسلام کا احترام کرے اور اس کے احکام کو تسلیم کرے، جیسا کہ ایمان کا تقاضہ ہے۔

فوجی حکومت جو فوج کی طاقت سے ترکی پر حکمراں ہے، اس کی وفاداریاں اللہ اور اس کے رسول صلعم سے نہیں، اتاترک سے ہیں، اس کے نزدیک دین کی تبلیغ کرنا اور یہ دعوت دینا کہ زندگی کو دین کے رنگ میں رنگ لیا جائے، ایک ایسا جرم ہے جس پر عدالت سے سزا دی جاتی ہے، اگرچہ تبلیغ و اشاعت کا یہ کام آئینی حدود میں رہتے ہوئے ان ذرائع و وسائل کے ذریعہ ہی کیوں نہ انجام دیا جائے جو ساری جمہوری دنیا کے لئے معروف و مقبول وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان لوگوں پر اس لئے مقدمہ نہیں چلایا گیا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طاقت استعمال کی تھی اور تشدد کی راہ اپنائی تھی یا حکومت کو بدلنے کے لئے کوئی خفیہ مسلح سازش کی تھی بلکہ یہ مقدمہ اس لئے چلایا گیا تھا کہ یہ لوگ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلام کو اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا دین مانتے ہیں۔ یہ لوگ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے اسلام کو عقیدہ، شریعت اور نظام حیات بنا کر اتارا ہے۔ وہ جس اسلام پر ایمان رکھتے تھے، لوگوں کو اسی کی دعوت بھی دیتے تھے، تبلیغ و اشاعت کا یہ کام زور زبردستی سے نہیں حکمت اور دانائی اور افہام و تفہیم کی راہ اپنا کر کرتے تھے، جائز اور آئینی ذرائع، پریس اور پلیٹ فارم سے اس کام کو انجام دیتے تھے۔

فوجی سرکار کی طرف سے ان لوگوں پر جو فرد جرم عائد کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے درج ذیل چیزوں کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

اسلام ہی راہ ہے۔

محمدؐ ہی قائد ہیں۔

اسلام ہی قانون ہے۔

قرآن ہی دستور ہے۔

کیا کوئی مسلمان جب تک اس بات پر راضی ہے کہ اللہ اس کا رب، اسلام اس کا دین اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں، ان شعاروں میں سے کسی شعار کا انکار کر سکتا ہے؟

اب ایسی حالت میں وہ مسلمان کیا کریں جو اپنے عقیدہ کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں، لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ کفر کو لازم قرار دے دیا گیا ہے ایمان کو ردّ کر دیا گیا ہے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیا گیا ہے۔

کیا یہی وہ الٹی حالت نہیں ہے جو تشدد، ایک رخے پن اور غلو کو جنم دے رہی ہے؟ ایک افریقی عرب ملک نے اشتراکیوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ دستور اور قانون کے زیر سایہ اپنی جماعت بنائیں اور کھلے عام اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں، جب کہ اسلام پسندوں پر جو امّت کے افکار و آلام اور آرزوؤں کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ پابندی عاید ہے کہ وہ اپنی کوئی جماعت نہیں بنا سکتے، اور بس اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسلام پسندوں اور ان کے رہنماؤں کو جیل کی چہار دیواری کے اندر پہنچا دیا گیا اور انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ آخر ان لوگوں کا اس کے سوا اور کیا جرم تھا کہ یہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے، ہمارا رخ درست ہے، اسلام ہی

حق و باطل کے لئے میزان ہے۔ کلمہ ہمارا ہتھیار ہے، معرفت الٰہی ہمارے لئے زاد راہ ہے۔ تو کیا ہم نوجوانوں کو ان کی اس بات پر ملامت کریں گے، کہ وہ حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن کی راہ سے مایوس ہو کر ایک دوسرا راستہ تلاش کر رہے ہیں تاکہ قوت کا قوت سے اور تشدد کا تشدد سے مقابلہ کریں۔ جیسا کہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

"جب لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تو میں نے حملہ کا جواب حملہ سے دیا۔ تو کیا میں ظالم ہوں؟"

صحیح اسلام پر سختی اور دباؤ کی یہ حالت ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی۔ اسلام کو انصار اور مددگار مل کر رہیں گے۔ امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ مخالفت کرنے والوں کی مخالفت انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی، انھیں راہِ حق سے ہٹا نہ سکے گی۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آجائے۔ پھر تو ہمارے لئے، ہمارے دین کے لئے اور ہماری دنیا کے لئے، یہی زیادہ اچھی بات ہے کہ ہم اس گروہ کو چھوڑ دیں تاکہ کھلی فضا میں فطری نشو و نما پائے۔ دباؤ اور ضبطی کی فضا سے دور رہ کر آزادی کے ماحول میں سانس لے، ورنہ یہ طبقہ یا گروہ اپنے لئے دوسری راہ تلاش کرے گا۔ اور ہمارے نہ چاہنے کے باوجود وہ اسی دوسری راہ کی فضا اور تقاضوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا لے گا۔

اسلام کی دعوت پانی کے پرزور دھارے کی طرح ہے۔ وہ اپنے لئے چٹانوں کے درمیان سے راہ بنا لے گی۔ اگر اس دعوت کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کو نہیں کھولا گیا تو یہ اپنے لئے زیرِ زمیں راہ تلاش کر لے گی۔ جہاں تاریکی ہوتی ہے۔ غلو کے لئے دل و دماغ کے دروازے وا ہو جاتے ہیں اور غلطیوں کو درست کر کے راہِ راست کی طرف کوئی لوٹانے والا نہیں ہوتا۔

تشدّد اور سخت سزائیں

تشدّد اور سخت سزاؤں سے شدّت پسندی اور غلو کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس سے شدّت پسندی کو اور فروغ ملتا ہے۔ چنانچہ جب اقتدار کی طرف سے ان جیلوں میں جسمانی اور نفسیاتی سزاؤں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جہاں لوگوں کو کوڑوں سے ہنکا کر لایا جاتا ہے اور باڑوں میں جو سلوک جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے اس سے بھی بدتر سلوک ان کے ساتھ کیا جاتا ہے تو شدت پسندی اور غلو کے اسباب اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔

دین پسند مسلمانوں نے جیلوں کے اندر طرح طرح کی جو سزائیں دیکھی ہیں — ان کے ذکر سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی ہولناکیاں، بچوں کو بوڑھا کر دیتی ہیں، سجن حربی اور دوسرے قید خانوں سے پوچھئے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۵ء میں ان کی چہار دیواری میں کیسی کیسی سزاؤں سے لوگوں کو دوچار ہونا پڑا۔ بیدوں سے نوجوانوں کی کھالیں ادھیڑ دی گئیں، ان کے جسموں کو شعلوں اور جلتے ہوئے سگریٹوں سے داغا گیا۔ مردوں اور کبھی کبھی عورتوں کو بھی۔ پاؤں کے بل اُلٹے اس طرح لٹکا دیا گیا جیسے ذبیحہ کو لٹکایا جاتا ہے اور پھر جلاّدان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ایک مارتے مارتے جب تھک جاتا تھا تو دوسرا جلاّد ڈنڈا سنبھال لیتا تاکہ اس کا پہلا ساتھی دم لے لے۔ یہاں تک کہ مظلوم کا جسم خون اور پیپ کا لوتھڑا بن جاتا۔ کتنے ہی لوگ ان سزاؤں کی تاب نہ لا سکے اور شہید ہو گئے لیکن ان سنگ دل ظالموں کا دل نہ پسیجا، نہ انھیں کوئی پرواہ تھی کہ کون مر رہا ہے کون جی رہا ہے، ان کے دلوں میں نہ خدا کا خوف تھا، نہ مخلوق کے لئے رحم کا کوئی جذبہ۔ جسمانی اور نفسیاتی سزاؤں کے لئے۔ دماغوں کی دُھلائی اور انسانیت کو رُسوا کرنے کے لئے، نازیوں نے، آمروں نے، اشتراکیوں نے جو جو طریقے ایجاد کئے تھے وہ سب آزمائے گئے بلکہ ان میں کچھ اضافہ ہی کیا گیا۔

ایذا رسانی اور تعذیب کی اسی گرم بھٹی میں "شدت پسندی" کی پیدائش ہوئی۔ اسی بھٹی میں تکفیر کا پودا اُگا اور اسی گرم فضا میں اسے ایسے عوامل ملے جو ان افکار کو پروان چڑھانے میں مددگار بن گئے۔

ان مظلوموں کے دلوں میں ایک سیدھا سا سوال ابھرا، یہ ساری سزائیں ہمیں کیوں دی جا رہی ہیں؟ ہم نے کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟ ہم نے تو صرف یہی کہا ہے کہ "اللہ ہمارا رب ہے، اسلام ہمارا راستہ ہے اور قرآن ہمارا دستور ہے۔ اس کے لئے نہ ہم کسی سے جزا کے طالب ہیں نہ شکر گذاری کے۔ ہم تو اپنی دینی ذمہ داری کو پورا کر رہے ہیں تاکہ ہمارا رب ہم سے راضی ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی اسلامی ملک میں اسلام کے اس کام کو جرم سمجھ کر ہمیں ایسی سزائیں دی جائیں؟

پھر اسی سوال سے دوسرا سوال پیدا ہوا، جو وحشی ہمارے جسموں کو جھنجھوڑ رہے ہیں ہمیں مارتے مارتے بے ہوش کر دیتے ہیں، ہماری شرافت کو پاؤں سے روندتے ہیں ——— ہمارے دین کو گالیاں دیتے ہیں، ہماری مقدس چیزوں کی بے حرمتی کرتے ہیں، ہماری عبادتوں اور نمازوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، ہمارے رب کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ایک بڑے نے ایک بار کہا — اپنے رب کو بلا لو۔ میں اسے بھی قید خانہ کی کوٹھری میں ڈال دوں گا۔ تو کیا ان لوگوں کا شمار مسلمانوں میں ہوگا؟ اگر یہ لوگ مسلمان ہیں تو کفر کہاں ہے؟ نہیں۔ یہ کفار ملت سے خارج ہیں، ان کا کوئی دین نہیں ہے۔

پھر یہ لوگ اس سوال سے ایک اور سوال کی طرف منتقل ہو گئے، جو لوگ ہمیں سزا دے کر موت کی وادی میں پہنچا دیتے ہیں اگر ان کے لئے یہی حکم ہے تو ان کے آقاؤں کے لئے کیا حکم ہوگا جو انھیں حکم دیتے ہیں، ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان تک فیصلوں کو پہنچاتے ہیں اور ان قائدین اور حکام کے لئے کیا حکم ہوگا جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ہے

جنہیں امر و نہی کا اختیار حاصل ہے۔ اور جو صرف اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے بلکہ پوری شدت اور طاقت سے ہر اس شخص کی مخالفت کرتے ہیں جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے؟ کیا ان لوگوں کا کفران لوگوں کے مقابلہ میں بڑھا ہوا نہیں ہے، کیا ان کا اسلام سے ارتداد زیادہ واضح نہیں ہے۔ ان کے بارے میں ہمارے لئے اللہ کا ارشاد کافی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ — اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں (المائدہ - ۴۴)

اور جب یہ لوگ اس نتیجہ پر مطمئن ہو گئے اور اس پر یقین کر لیا تو پھر چوتھے سوال کی طرف منتقل ہو گئے اور اس کو اپنے دوسرے قیدی ساتھیوں کے سامنے پیش کیا! آپ لوگوں کا ان حکام کے بارے میں کیا خیال ہے جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ یہ لوگ ہر اس شخص کو سخت سزائیں دیتے ہیں جو لوگوں کو اللہ کے قانون کی طرف بلاتا ہے؟

تو جو لوگ تکفیر کے اس مسئلہ میں ان کی ہم نوائی کرتے، ان کا شمار وہ اپنے ساتھیوں میں کرتے لیکن جو لوگ توقف کرتے، ان کا شمار بھی کافروں میں ہوتا، اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ کفار کے کفر میں شک کے مترادف ہے اور جو کفار کے کفر میں شک کرتا ہے وہ کافر ہوتا ہے۔

یہ لوگ اسی حد پر پہنچ کر رک نہیں گئے، بلکہ پانچویں سوال کی طرف منتقل ہو گئے کہ یہ جمہور جو ان حکام کی اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہیں جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے بغیر فیصلے کرتے ہیں۔۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کا جواب ان لوگوں کے پاس پہلے ہی سے موجود تھا کہ یہ لوگ بھی

حکام کی طرح کافر ہیں اس لئے کہ یہ لوگ ان حکام کے کفر پر راضی ہو گئے ہیں۔ اسے استحکام بخشتا ہے اور ان سے خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر سے راضی ہونا خود کفر ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جہاں سے تکفیر کی موج اٹھی ہے۔ اس کا آغاز بجن حربی سے ہوا اور پھر اس بنیادی فکر سے شدّت پسندی کی کئی شاخیں پھوٹی ہیں۔

یہ زندگی کا وہ قانون ہے جس کا ہمیشہ مشاہدہ اور تجربہ ہوا ہے کہ تشدد سے تشدد ہی پیدا ہوتا ہے اور جب دباؤ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو دھماکہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

فصل سوم

علاج کی راہ

جسے دینی شدت پسندی اور غلو کہا جاتا ہے، اس پر ہم نے کچھ نہ کچھ روشنی ڈال دی ہے، اس کی حقیقتوں اور علامتوں کو بھی اجاگر کر دیا ہے اور اس کے اہم اسباب وعوامل کی بھی نشان دہی کر دی ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو 'غلو' اور شدت پسندی کے جذبات کو ابھارتی ہیں۔ اب صرف ایک بات ہمارے پوچھنے کے لئے رہ جاتی ہے کہ ـــــ ان خرابیوں کا علاج کیا ہے؟ اسے ختم کرنے کے لئے کیا طریقے اپنائے جا سکتے ہیں اور کون یہ علاج کرے گا؟

یہاں ہم اس پہلو پر بھی زور دینا چاہتے ہیں کہ علاج، اسباب سے الگ نہیں ہو سکتا، ان دونوں میں گہرا ربط ہے، پھر جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ سبب کئی ہیں اور نوع بہ نوع ہیں۔ تو ضروری ہے کہ علاج میں بھی گوناگونی اور تنوع پایا جائے۔ کسی جادو کی چھڑی سے پلک جھپکتے اس روگ کا علاج نہیں ہو سکتا اور نہ شدت پسندوں کو راہِ اعتدال پر لایا جا سکتا ہے جن امراض اور جن خرابیوں کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے وہ زیادہ گہری اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اتنی آسانی سے ان کا علاج نہیں

ہو سکتا، اب اگر اسباب و عوامل ہیں کچھ فکری اسباب و عوامل ہیں، کچھ نفسیاتی اور کچھ اجتماعی اور سیاسی ہیں تو علاج کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ فکری، نفسیاتی، سیاسی اور اجتماعی ہو اور اس علاج کی بنیاد اسلام ہو اور اسلام ہی کی روشنی میں اسے انجام دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اس روگ کے ظاہری روپ رکھا میں دینی بنیاد موجود ہے۔

میں یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان جبریوں میں نہیں ہوں جو ہر چیز کی ذمہ داری صرف سماج پر ڈال دیتے ہیں یا سماج کی اقتصادی ساخت اور وضع پر اور نوجوانوں کو ان کی سرگرمیوں اور تصرفات کی ذمہ داری اور عواقب سے بری قرار دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نوجوان تو ہوا کے جھونکے ہیں، ایک پر کی مانند ہیں، ہوا جیسے چاہے انہیں الٹتی پلٹتی رہتی ہے، اسی سے ملتی جلتی بات پہلے دور میں دینی حلقوں میں جبری فکر کے مبلغین نے کہی ہے۔

اسی طرح میرے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ میں ساری ذمہ داری نوجوانوں پر ڈال دوں اور سماج کو، حکومت اور حکومت کے مختلف اداروں کو خصوصاً تعلیم و تربیت اور نشریات کے ذمہ داروں کو بری الذمہ قرار دے دوں۔ یہ عدل و انصاف کی بات نہ ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ذمہ داری مشترک ہے اور ہر ایک کا اپنا اپنا کردار ہے۔

کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیتہ (بخاری)	تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اپنے ماتحت رہنے والوں کا ذمہ دار ہے۔

اور یہیں ایک بڑا سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اگر سماج یہ چاہتا ہے کہ شدت پسندی اور غلو پر اعتدال پسندی غالب آجائے تو خود سماج کو اس کے لئے

کیا کرنا ہوگا؟ اور نوجوانوں کو اس غلو کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ اور اس پر کیا نتائج مرتب ہوں گے؟ اب اگلے صفحات میں ہم انھیں سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

سماج کا کردار

گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شدت پسندی اور غلو کے ظہور و نمو میں سماج کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، سماج نے اپنے اندر پائے جانے والے تناقضات اور پراگندگی کے ساتھ اس سلسلہ میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے اور اب یہ اس کا فرض ہے کہ اس روگ کے علاج کے سلسلہ میں بھی وہ اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

لیکن اس کا آغاز ایک اہم نقطہ سے ہوگا، سماج جب اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتا ہے تو اسے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اس نسبت کے تقاضے کیا ہیں۔ سلوک کیسا ہونا چاہئے۔ کن چیزوں کی پابندی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اسلام صرف ایسا دعویٰ اور نعرہ نہیں ہے جسے زبان سے دہرایا جاتا رہے۔ اور نہ وہ صرف کسی ایسی نص یا تحریر کا نام ہے جو دستور میں ثبت کردی جائے کہ حکومت کا دین اسلام ہے اور پھر زندگی کی گاڑی اسلام کی مخالف راہوں پر چلتی رہے۔ سماج کو اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل راستہ ہے اسلام زندگی کو خدائی رنگ میں رنگ دیتا ہے اور اسے اخلاقی رخ پر لگا دیتا ہے اور پھر اس راستہ کے حدود اور نشانات کو مقرر کر دیتا ہے، منزل اور ہدف کو مقرر کر دیتا ہے تاکہ اس پر چلنا آسان ہو جائے، ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کی بھی کوشش کرتا ہے کہ کوئی راہ سے بھٹک نہ جائے، کسی گڑھے میں گر نہ

جائے یا کسی چوراہے پر کھو نہ جائے

اسلام عبارت ہے ان عقائد و عبادات، اخلاق و شریعت اور آداب سے، جن سے فکر کو درستگی ملتی ہے قلب کو پاکی حاصل ہوتی ہے، نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، سماج میں عدل قائم ہوتا ہے اور زندگی کو حُسن و جمال حاصل ہوتا ہے

پس کسی سماج کے صحیح مسلم سماج ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پورے اسلام کی پابندی کرے اور اسے اسرائیلی سماج کی طرح نہیں ہونا چاہیئے۔ جو تورات کے بعض احکام کو اپناتے تھے اور بعض کو چھوڑ دیتے تھے۔ ان کی اس روش پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

(البقرہ - ۸۵)

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دئے جائیں؟

سماج کے صحیح مسلم سماج ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں خواہ وہ اجتماعی ہو یا اقتصادی، سیاسی ہو یا فکری۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر راضی رہے۔ عہد ایمان کا یہی تقاضہ ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

(النساء - ۶۵)

نہیں اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کر و اس پر یہ اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
(النور - ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

پس ہمارے سماج کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری زندگی میں اسلامی عقائد اور اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے پیش نظر آج جو کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے وہ دور ہو۔ یہ تضاد اللہ کے احکام کو منجمد کر دینے، حدود کو معطل کر دینے، اسلامی آداب و رہنمائی کے تئیں غفلت برتنے اور مشرق و مغرب سے زندگی کے مختلف نظاموں کی درآمد سے پیدا ہوا ہے۔ اس تضاد کو دور کر کے ہم اپنے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

اسلامی شریعت کی طرف واپس آؤ

عالم اسلام میں مسلم حکام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کریں کہ وہ اسلامی وطن میں زندگی گذار رہے ہیں اور جن لوگوں پر وہ حکمراں ہیں وہ بھی مسلمان ہیں اور ہر قوم کا یہ فطری حق ہے کہ اس پر جو حکومت قائم ہو وہ اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہو اور اس کے دستور حکومت اور ملکی قوانین پر اس کے عقائد و اقدار اور طور وطریقوں کی چھاپ پڑی ہو تعلیم و تربیت کا نظام اسی کے مطابق ہو تہذیبی و نشریاتی وسائل اسی کی حمایت اور اشاعت میں لگے رہیں اور ملک کی اقتصادی اجتماعی، داخلی اور خارجی پالیسی اسی کے دائرہ میں بنائی جائے اور اسی کے ہدف کو حاصل کرنے میں لگی رہے۔

اب رہی یہ بات کہ دعوی تو اسلام کا کیا جائے لیکن اسلامی حکومت کو

رد کر دیا جائے، قرآن اور سنت رسول سے اعراض کیا جائے، اسلامی شریعت اور شعائر سے منہ پھیر لیا جائے تو یہ وہ باتیں ہیں جسے نہ کوئی عقل قبول کر سکتی ہے اور نہ کوئی دین پسند کر سکتا ہے۔

بیشتر مسلم ملکوں میں حکام کا چیلنج اسلامی ضمیر کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

ان میں کچھ ایسے حکمراں ہیں جو مشرق یا مغرب کی پیروی میں علی الاعلان اسلام کا رد کرتے ہیں، ان کے لئے یہ بات بھی قابل قبول نہیں ہے کہ اسلام کے لئے کوئی گوشہ باقی رہے جہاں وہ اپنی حقیقت کو واضح کر سکے، یہاں تک کہ اب مسجدوں میں بھی حکمراں کی تائید لازم ہو گئی ہے اور اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرتا ہے تو نہ پوچھئے کہ اس پر کیا گذرتی ہے۔ ہائے تباہی، وائے تباہی۔

ان میں کچھ ایسے حکمران ہیں جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا اسلام خود ان کی عقل کا بنایا ہوا اسلام ہے۔ اس پر ان کے ہوائے نفس کی چھاپ پڑی ہوتی ہے جو چیزیں انہیں اسلام کی پسند آتی ہیں انہیں لے لیتے ہیں اور جو پسند نہیں آتیں اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں جو کچھ وہ فرمائیں وہی حق ہے اور جس کا انکار کر دیں وہ گمراہی ہے ان کے نزدیک اگلے اور پچھلے لوگوں اور معاصرین میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جس کی دینی اہمیت کا اعتراف کیا جائے پوری امت کی، سلف و خلف کی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے لوگوں کی مخالفت کرنے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی اور نہ انہیں ائمہ فقہ، علمائے اصول، مفسّرین قرآن اور شارحین حدیث کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یہ اپنے آپ کو فقیہ، اصولی، مفسّر، محدّث،

فلسفی سب کچھ سمجھتے ہیں جیسا کہ ایک قدیم شاعر نے کہا ہے۔

اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ ساری دنیا کی خوبیاں ایک فرد میں جمع کر دے۔ اور یہ اپنے آپ کو وہی فرد سمجھتے ہیں جس کا کوئی ثانی نہیں ہے یہ اللہ کے رسولؐ سے کچھ لینے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ اپنے گمان سے سمجھتے ہیں کہ قرآن نے انہیں اللہ کے رسول سے بے نیاز کر دیا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ آپؐ ہی قرآن کے مفہوم و مراد کی وضاحت کرنے والے ہیں۔ خود قرآن کا ارشاد ہے :

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ (النساء — ۸۰)
جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔

ان میں کچھ حکمران ایسے ہیں جو افکار و نظریات اور قوانین کو درآمد کئے ہوئے ہیں لیکن اپنی ناپسندیدگی کے باوجود اسلام کے لئے ایک گوشہ چھوڑ رکھا ہے۔ مثلاً " اسلامی پرسنل لا" ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام میں " دینی باتیں " یا اخبار و رسائل کے جمعہ ایڈیشن میں " دینی صفحہ "۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ یہ گوشہ بھی دین کے لئے ہے، اسلام کے لئے نہیں۔ دین کا یہاں وہی مفہوم ہے جو یورپ میں چرچ کا ہے۔ دین بندہ اور خالق کے درمیان نجی تعلق کا نام ہے۔ عملی زندگی اور سماج سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جو قیصر کا ہے قیصر کو دیدو اور جو اللہ کا ہے اللہ کو دیدو۔

ان لوگوں کے نزدیک دین کا یہی مفہوم ہے۔ وہ عقیدہ ہے شریعت کے بغیر، دین ہے اسٹیٹ کے بغیر، انفرادی عبادت ہے دعوت و جہاد کے بغیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر اور اگر کہیں آپ نے اپنے منبر یا پلیٹ فارم

سے یا اپنے اخبار کے ذریعہ کسی منکر کے خلاف کچھ بول یا لکھ دیا۔ یا کسی بے راہ روی پر تنقید کر دی، یا دعوت حق کی حمایت کر دی یا باطل کا مقابلہ کرنے لگے تو آپ سے کہا جائے گا آپ اپنے دائرہ سے تجاوز کر رہے ہیں، آپ حد سے آگے بڑھ رہے ہیں، آپ نے دین کو سیاسی روپ دے دیا ہے اور آپ سیاست کو دینی بنا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کے لئے یہ لازم تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ اور تابعینؒ اور امت مسلمہ کے اسلاف و اخلاف نے جو تعلیم دی ہے اس سب کے برخلاف آپ یہ جانیں کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں سیاست میں کوئی دین نہیں اور دین میں کوئی سیاست نہیں۔ اب وقت آگیا ہے ہمارے فرماں روا اور حکام یہ بات جان لیں کہ اب ان کی قوموں کے لئے چھٹکارا اور ان کے سماج کی پائیداری اور برقراری کے لئے اگر کوئی راہ ہے تو وہ صرف اسلام ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے

> ”ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ عزت دی۔ اور جب جب ہم اسلام کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے عزت کے طلب گار بنیں گے تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔“

جب تک ہماری زندگیوں پر اسلام کی فرماں روائی قائم نہیں ہوتی تب تک ہمارے سماج سے وقتاً فوقتاً دیندار شدت پسند اور غیر دین دار شدت پسند گروہوں کا ظہور ہوتا رہے گا۔

محبت اور شفقت کا برتاؤ

اس علاج کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ہم بلند برجیوں میں بیٹھ کر

اپنی بڑائی جتاتے ہوئے اور اپنی برات کا اعلان کرتے ہوئے ان نوجوانوں سے بات نہ کریں۔ اس سے ہمارے اور ان کے درمیان چوڑی اور گہری کھائی پیدا ہو جائے گی۔ پھر نہ وہ ہم پر اعتماد کریں گے اور نہ توجہ سے ہماری باتیں سُنیں گے۔ اور اس طرح ہمارے لئے بھی نوجوانوں کا سمجھنا اور ان کی زندگیوں کے حقائق و مشکلات کا جاننا دشوار ہو جائے گا۔

نوجوانوں کے سلسلہ میں ہمارا موقف مدعی کا نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہم ان کی برائیوں کو اجاگر کرنے ان کے سلبی کاموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے ان کی نیتوں پر شک کرنے اور ان کے کاموں پر طعن کرنے میں لگے رہیں اور پھر انہیں چیزوں کی بنیاد پر چاہیں کہ انھیں سخت ترین سزائیں دی جائیں۔

اس سلسلہ میں اولین ضروری بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے ساتھ ہمارے معاملات اور سلوک میں پدرانہ شفقت اور برادرانہ الفت کی روح ہونی چاہیئے۔ ہم احساس دلادیں کہ وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ہماری آرزو اور ہمارا مستقبل ہیں۔ ہمیں اسی محبت اور شفقت کی راہ سے ان تک پہنچنا چاہیئے۔ تہمت تراشی اور برتری کی راہ سے نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں ان نوجوانوں پر تہمتوں کے تیر برسائے جا رہے ہیں۔ آگے اور پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے نیک نیتی یا بد نیتی سے انھیں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہاں ہمیں ان نوجوانوں کی مدافعت کرنی چاہیئے۔ اور اگر ہم کچھ اسباب کے باعث استغاثہ کے وکیل کا کردار ادا نہیں کر سکتے تو انصاف پسند عدلیہ کا رویہ اپنانا چاہیئے جو دلیل کے بغیر نہ کسی کو مجرم قرار دیتی ہے

اور نہ مدعی اور مدعا علیہ میں سے کسی کی جانب داری کرتی ہے۔

یہ ہمارے لئے خرابی اور عیب کی بات ہے کہ اجتماعی مسئلوں میں ہمارے احکام جلد بازی پر مبنی ہوتے ہیں نیز ہم انہیں عمومی روپ دے دیتے ہیں، آخری اور قطعی شکل میں اس طرح فیصلے صادر کرتے ہیں جس میں تبدیلی اور از سرِ نو غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور یہ سب کچھ ہم فریقِ مخالف کی صفائی اور دلیل سنے بغیر کرتے ہیں یہ کوئی انصاف کی بات تو نہ ہوئی۔

ہم میں سے اکثر لوگ دور سے بیٹھے ان نوجوانوں پر حکم لگاتے ہیں۔ نہ ان سے ملتے ہیں نہ تعارف حاصل کرتے ہیں نہ ان کے اسلوب فکر اور احساس سے آگاہ ہوتے ہیں، نہ ان کے سلوک اور معاملات سے۔

بہت سے لوگ چند افراد کے تصرفات کو سامنے رکھ کر سارے نوجوانوں پر حکم لگا دیتے ہیں جب کہ چند افراد کے تصرفات کے پیشِ نظر عمومی حکم لگانا صحیح نہیں ہوتا۔ ہمارے فقہاء کے ہاں یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ اکثریت پہ کل کا حکم لگایا جاتا ہے لیکن شاذ و نادر پہ نہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جو کسی ایک شخص کے صرف ایک کام کو دیکھ کر اس پر شدت پسندی کا حکم لگا دیتے ہیں۔ جب کہ اس کا امکان ہے کہ اس کے کچھ اسباب و عوامل ہوں یا خود اس شخص کے پاس اپنے کام کی ایسی وضاحت موجود ہو کہ اگر اسے سن لیا جائے تو الزام لگانے والے اپنے الزام کو واپس لے لیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ کسی شخص کے ایک دو تصرفات کو دیکھ کر اس کی پوری اخلاقی زندگی کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا جائے۔ انسان کے بارے میں صحیح رائے اس کے سارے کاموں کو سامنے رکھ کر قائم کی جا سکتی ہے

اور جن کی اچھائیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے سے بھاری ہوتا ہے وہ اچھے اور بھلے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر اللہ اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المؤمنون - ١٠٢) اس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے۔

ان کے علاوہ کچھ اور دوسرے لوگ ہیں جو ان نوجوانوں پر حکم لگاتے ہوئے دینداری اور دینداروں کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ لوگ ذہنی مریض ہیں، نفسیاتی الجھنوں اور باطنی امراض میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک محدود تعداد پر یہ بات صادق آتی ہو لیکن مجموعی اعتبار سے یہ نوجوان نفسیاتی لحاظ سے بہترین تندرستی کے مالک ہیں۔ عملی لحاظ سے یہ بڑے مخلص ہیں، ان کے ظاہر اور باطن میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی زندگیاں تناقض سے پاک ہیں۔ ان کے عقیدہ اور عملی رویہ میں، ظاہر اور باطن کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

میں خود اس بات کا گواہ ہوں، بیشتر مسلم ملکوں میں ان نوجوانوں سے میرا ملنا جلنا رہا ہے، بہت قریب سے میں نے دیکھا اور سمجھا ہے، میں نے تو یہی دیکھا کہ ان کے اندر دین کا قوی جذبہ ہے، یقین میں پختگی ہے، بات میں سچائی ہے، عمل میں اخلاص ہے، حق کی محبت ہے، باطل سے کراہیت ہے، دین کی تبلیغ و دعوت سے دلچسپی اور رغبت ہے، طاغوتی دعوتوں سے بے تعلقی ہے بھلائی کے پھیلانے اور برائی کے مٹانے پر اصرار ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے دلوں میں سوز پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں اور ایک ایسے سماج کے قیام کے مشتاق ہیں جہاں زندگی مکمل

اسلامی زندگی ہو۔ جہاں عقیدہ کی رہنمائی ہو، شریعت کی حکمرانی ہو نظم وضبط پر اخلاق کی چھاپ پڑی ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ ان نوجوانوں میں ہمارے تقلیدی اسلام کے مقابلہ میں ایک نیا اور زندہ اسلام ہے۔ ہمارے موروثی اور ٹھنڈے ایمان کی جگہ ان کے ایمان میں جوش اور حرارت ہے۔ بھلائی کے کاموں کے لئے ہمارے نڈھال ارادوں کے مقابلہ میں وہ پختہ اور مضبوط ارادوں کے مالک ہیں، میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی خشیت اور محبت سے معمور ہیں ان کی زبانیں قرآن کی تلاوت اور ذکر الٰہی سے تر رہتی ہیں۔ اسلامی شریعت کے جن گوشوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا جن سنتوں کو مردہ بنا دیا گیا ہے انہیں زندہ کرنے کے لئے ان کے اندر بھرپور عزم پایا جاتا ہے۔

میں نے ان نوجوانوں کو دیکھا ہے۔ راتیں نماز اور استغفار میں گزارتے ہیں اور دن روزے میں۔ بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لئے خوشخبری حاصل کرنے والوں نے ان کے وجود میں خوشخبری پائی اور وہ امید کرتے ہیں۔ اور میں بھی ان کی اس آرزو اور امید میں شریک ہوں کہ اسلام کا بہتر مستقبل ان سے وابستہ ہے،

مصر میں مختلف جگہوں پر میں نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ مصر کے پاس سب سے بڑی دولت یہی بشری دولت ہے، اس کی قیمت کا اندازہ کسی مادی چیز سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سے میری مراد یہی نوجوان تھے جن کی جوانیاں اللہ کی اطاعت اور اس کے دین کی نصرت میں لگی ہوئی ہیں

انتہا پسندی کی تصویر کشی میں انتہا پسندی سے احتراز کیجئے

جو شخص اس روگ کے علاج کے لئے آگے بڑھتا ہے، میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ اس کے فیصلوں میں اعتدال اور توازن پایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ انتہا پسندی اور اس کے علاج کے سلسلہ میں بات کرتے ہوئے وہ خود انتہا پسند اور غالی بن جائے اور یہاں اعتدال کی پہلی علامت یہ ہے کہ نام نہاد انتہا پسندی کی تصویر کشی میں اس سے خوف زدہ کرنے میں ہم مبالغہ سے کام نہ لیں۔ رائی کو پہاڑ نہ بنائیں، بلی کو اونٹ نہ گردانیں۔ مبالغہ سے نقصان ہی نقصان ہوگا، کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ مبالغہ حقائق کی صورت بگاڑ دیگا معیار کو بدل دے گا، چیزوں کا صحیح ادراک نہ ہو پائے گا، ایسی حالت میں کسی چیز کے بارے میں موافق یا مخالف جو فیصلہ یا حکم صادر کیا جائے گا وہ زیادتی یا نقص سے خالی نہ ہوگا۔

لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ جب سے نوجوانوں کا بحران پیدا ہوا ہے اور اقتدار سے تصادم کی نوبت آئی ہے یا وہ چیز ظہور میں آئی ہے جسے دینی انتہا پسندی کہا جاتا ہے۔ اس وقت سے جو کچھ کہا جا رہا ہے یا لکھا جا رہا ہے یا اس سے پہلے جو کچھ کہا یا لکھا گیا ہے ان میں سے بیشتر باتیں مبالغہ سے خالی نہیں ہیں، اس موضوع پر لکھنے اور بولنے والوں میں خود انتہا پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بھی نوجوانوں کے خلاف جو فضا بن گئی تھی اس سے متاثر ہو گئے تھے، ان ہی باتوں سے متاثر ہو کر سماجی علوم کے ایک ماہر استاد نے قاہرہ سے شائع ہونے والے اخبار الاہرام میں ایک مقالہ لکھ کر ان لکھنے والوں کی زیادتیوں کیخلاف آواز بلند کی جو اس موضوع پر علم دین اور قرآن کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر قلم کی

جولانیاں دکھا رہے تھے۔

ایسے لوگوں کے لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے یا بولنا ہی ہے تو حق و انصاف کی بات کہیں۔ انتہا پسندی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اعتدال اور حقیقت کی راہ سے نہیں ہٹنا چاہئے۔

دین میں انتہا پسندی۔ اکثر و بیشتر رد عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ دینی احکام کی پابندی سے آزادی، دین کی تحقیر کرنا۔ دین کو مذاق اور تمسخر کا موضوع بنانا یہ وہ باتیں ہیں جن سے فطری طور پر انتہا پسندی پیدا ہوتی ہے۔ یہی عمل اور رد عمل کا قانون ہے۔ پھر کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ دینی احکام سے آزادی ــ اور بے راہ روی کی انتہا پر پہنچنے والے بھی اس سے آگاہی حاصل کریں ــ اور اعتدال کی درمیانی راہ پر واپس لوٹ آئیں۔ اور اسی طرح دوسرا فریق بھی اعتدال کی راہ پر آجائے تاکہ یہی اعتدال کی درمیانی راہ دونوں گروہوں کے درمیان ملاپ کا سنگم بن جائے۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ زندگی کو خود بھی بسا اوقات شدت پسندی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اس شدت پسندی کا مقابلہ کر سکے جو اس کے مخالف ہے۔ یہاں تک کہ دین میں شدت پسندی اور دین سے بے راہ روی کے درمیان ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں۔ لوہے کا مقابلہ لوہے سے ہی کیا جاتا ہے۔ یہی مدافعت کے لئے ضروری ہے

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ ـ ۲۵۱)	اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ دینی احکام کی پابندیوں اور دینی قدروں سے اعراض کے معاملہ میں انتہا پسندی کا رویہ اپناتے ہیں انھیں ان مخالفتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جن کا سامنا دین پسندوں اور دین سے والہانہ محبت رکھنے والوں کو کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ انتہا پسندی کی مخالفت اگر ضروری ہے تو دونوں فریقوں کی انتہا پسندی کی مخالفت ہونی چاہئے۔

تو کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ ہم اپنا سارا غصہ ان نوجوانوں پر نکالیں، جو اسلام کو گلے لگائے ہوتے ہیں ــ نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں منکرات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، نگاہوں کو نیچی رکھتے ہیں۔ زبانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حلال کو اپناتے ہیں، حرام سے بچتے ہیں۔ اسلامی زندگی کے حریص ہیں۔ داڑھیاں بڑھاتے ہیں، لباس کو حدود میں رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسواک سے منہ صاف ہوتا ہے، اور رب کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ اپنے وقت کو لغو کاموں سے بچاتے ہیں۔ غیر مفید چیزوں میں اپنا پیسہ نہیں ضائع کرتے، یہاں تک کہ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتے، تو کیا ہم اس نوجوان کی مخالفت کریں جس کی اللہ کی اطاعت میں نشو و نما ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ شدت پسندی کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ جب کہ ہم ان نوجوانوں کے سلسلہ میں خاموش رہتے ہیں جنہوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا ہے۔ خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں بے راہ روی میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ لڑکا اور لڑکی میں تمیز نہیں ہو پاتی۔ یہ نہ معروف کو پہچانتے ہیں نہ منکر کی مخالفت کرتے ہیں، یہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے اصلیت کھو دی ہے یہ اپنے فکر و عمل میں مغرب کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

توکیا یہ انصاف کی بات ہے کہ جس چیز کا نام دینی انتہا پسندی رکھ دیا گیا ہے اس کے خلاف شور مچایا جائے اور اس کی شدید مخالفت کی جائے۔ لیکن لادینی انتہا پسندی کے سلسلہ میں ساری زبانیں خاموشی اختیار کرلیں؟

تو کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ جو دوشیزہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالتی ہے ہم اس کا اور اس کے لباس کا مذاق اڑائیں۔ حالانکہ اس نے جو کچھ کیا ہے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے کیا ہے۔ اپنے دین کی اتباع کے لئے کیا ہے۔ جب کہ ان کا ایک اور گروہ بھی ہے جو لباس بے لباسی میں بن سنور کر بلکہ بالکل عریاں حالت میں سڑکوں اور ساحلوں پر نکل کر یا پردۂ سیمیں پر ظاہر ہو کر دعوت نظارہ دیتا ہے۔ لیکن ان کی مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھتی کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ یہ شخصی آزادی کا مسئلہ ہے۔ دستور نے اس کی ضمانت دی ہے۔ تو کیا دستور نے عریانیت اور ابتذال کے لئے شخصی آزادی دی ہے اور جب معاملہ وقار اور دینی اقدار کے تحفظ کا ہو تو دستور اس آزادی کو سلب کر لیتا ہے؟

اگر سماج نے دین کی مخالفت اور دینی احکام سے کھلواڑ کرنے والوں کے تئیں ایجابی موقف اپنایا ہوتا اور منکرات کو اپنے ہاتھ اور زبان سے مٹانے کی کوشش کی ہوتی تو ہمارے سماج میں دینی انتہا پسندی کا وجود نہ ہوتا اور اگر کسی اور سبب سے پایا بھی جاتا تو اس کی تباہ کاریاں وہ نہ ہوتیں جن کا آج مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

مزید برآں یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آج دنیا میں طرح طرح کی انتہا پسندیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ کا تعلق دین سے ہے تو کچھ کا تعلق سیاست سے

فکر اور سلوک اور پالیسی سے ہے۔

اور اگر ہم دینی انتہا پسندی پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مشرق و مغرب میں شمال اور جنوب میں دنیا کے ہر ملک میں یہ انتہا پسندی پائی جاتی ہے۔ پھر یہ غیر مسلم انتہا پسند اپنی زبان سے اپنے کاموں اور کارروائیوں سے اپنی انتہا پسندی کا اعلان کرتے رہتے ہیں لیکن دنیا کی طرف سے ان کی ایسی مخالفت نہیں کی جاتی ہے جیسی مخالفت ان لوگوں کی کی جاتی ہے جنہیں مسلم انتہا پسند کہا جاتا ہے اور نہ ان کی حکومتیں ان کے بارے میں وہ موقف اپناتی ہیں جو مسلم حکومتوں نے مسلم انتہا پسندوں کے بارے میں اپنا رکھا ہے۔

ہم نے یہودی انتہا پسندی۔ صہیونی حکومت اسرائیل میں دیکھی ہے، جہاں انتہا پسندانہ ہدف اور اصولوں کا اعلان یہودی جماعتیں اور تنظیمیں بغیر کسی شرم و حیا کے کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ اسی کی بنیاد پر غاصب حکومت اسرائیل کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ان کے دینی صحیفوں اور تلمود نے انہیں یہ تعلیم دی ہے کہ یہود اللہ کی محبوب اور منتخب قوم ہے۔ دوسری قوموں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی خدمت میں لگی رہے غیر یہودیوں کا یہود پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہودیوں کے لئے دوسروں کے جان و مال اور وطن کو حلال بنا دیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز ان کے مقصد کی راہ میں روک نہیں بن سکتی۔

ہم نے نصرانی انتہا پسندی لبنان میں دیکھی ہے۔ جہاں مسیحی رضا کار اور ان کے مددگار مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں۔ آلۂ تناسل کو منہ میں لٹکا دیتے ہیں، لاشوں کا مثلہ کرتے ہیں، وحشیانہ طور پر عورتوں کی عزت و ناموس کو لوٹتے ہیں۔ مصاحف اور دینی کتابوں کو جلاتے ہیں، پاؤں سے روندتے ہیں اور ہر اس چیز کی اہانت اور

تذلیل کرتے ہیں جس سے مسلمانوں کا اسلامی تشخص ظاہر ہوتا ہے۔ پھر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ نصرانیت اور محبت اور سلامتی کے رسول مسیح کے نام پر ہوتا ہے، جس نے اپنے ماننے والوں سے کہا تھا

"اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ جو تم پر لعنت کرتے ہیں، تم انھیں برکت کی دعائیں دو اور جو تمھارے داہنے گال پر چپت مارے، اس کے سامنے تم اپنا بایاں گال بھی پیش کر دو"۔

ہم نے نصرانیوں کی یہ دینی انتہا پسندی لبنان میں دیکھی ہے۔ ترکوں کے خلاف قبرص میں دیکھی ہے، اریٹریائی مسلمانوں کے خلاف حبشہ میں دیکھی ہے اور فلپائن میں دیکھی ہے۔ جہاں جنوب میں مسلمانوں کو یہ انتہا پسندی اپنا نشانہ بناتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان انتہا پسندوں میں ہر گروہ کے عیسائی پائے جاتے ہیں، ان میں کیتھولک بھی ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی اور ان دونوں بڑے فرقوں سے متعلق دوسرے گروہ کے عیسائی بھی۔

ہم نے مشرکانہ انتہا پسندی دوسرے ملکوں میں بھی دیکھی ہے جہاں اکثریتی طبقہ کی متعصب جماعتوں کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کو دبایا جائے ـــ بلکہ انھیں ختم کر دیا جائے۔ اسی لئے کوئی سال ایسا نہیں گذرتا جو فرقہ وارانہ ہنگاموں سے خالی ہو . . . پھر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ انسانوں کو مرغی اور بکری کی طرح ذبح کرتے ہیں جو اپنے دل کی نرمی اور رقت کے نام پر مرغی اور بکری تک کے ذبیحہ کو حرام کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اندر روح ہوتی ہے، مچھروں اور کیڑوں کے مارنے والی دوائیوں کو بھی استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے کہ کیڑے مکوڑوں اور مچھروں میں بھی روح ہوتی ہے۔ چوہوں کو کھلی چھوٹ ملتی ہے اور وہ ٹنوں گیہوں کھا جاتے ہیں۔ ان یے

تعرض نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کہ ان کے اندر بھی روح ہوتی ہے لیکن تنہا مسلمان ہی ایسے ہیں جن کے اندر چوہوں، مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح کی روح بھی نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ہمیں بے چینی اور سرکشی کا زمانہ ملا ہے اور یہ نتیجہ ہے مادہ پرستی کی اس لہر کا جو آج انسان کے اسلوب فکر اور عملی رویہ پر غالب آگئی ہے، آج کے دور میں انسان چاند تک پہنچ گیا ہے لیکن اپنے آپ کو زمین پر خوش بخت نہ بنا سکا۔

مادی لحاظ سے آج کی تہذیب کامیاب تہذیب ہے لیکن روحانی پہلو سے یہ تہذیب دیوالیہ ہو چکی ہے، اسی چیز نے مغربی نوجوانوں کو ہپی بنا دیا ہے اور وہ مشینی زندگی اور مادی تہذیب کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ آج کی تہذیب و ترقی نے زندگی کے لئے جو وسائل اور آسانیاں فراہم کی ہیں انھیں چھوڑ کر وہ صحرا اور پسماندہ علاقوں کا رخ کر رہے ہیں۔ خوش حالی اور تن آسانی کا ہر سامان مہیا ہوتے ہوئے انھیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ضائع ہو رہی ہے۔ مغرب کے نوجوانوں کے سامنے زندگی کا کوئی مفہوم اور ہدف نہیں ہے، آج کی صنعتی تہذیب اس کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ میں کون ہوں؟ میرا پیام کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا اور کہاں جاؤں گا؟ ان سوالوں کا آج کی تہذیب کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

مادی تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہونے والی اس بے چینی اور سرکشی کی صدائے بازگشت ہمارے مسلم ملکوں میں بھی سنائی دینے لگی —— مختلف صورتوں میں یہ بے چینی سامنے آئی۔ کہیں دین سے آزادی، بے نیازی اور بے راہ روی پیدا ہوئی تو کہیں دین کی طرف جھکاؤ بڑھ گیا، اس لئے کہ مسلم نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے سوالوں کا جواب اسلام میں مل گیا اور پھر وہ پوری قوت اور جوش کے ساتھ

اسلام کی طرف پلٹ آئے۔ نوجوانی کی گرمی کے ساتھ ایمان کی حرارت اکٹھی ہو گئی۔ پھر اس سے جو شعلہ بنا، روشنی دینے لگا اور کبھی کبھی جلانے بھی لگا۔

یہ کوئی منطقی بات نہیں ہے کہ اس تمرد کے دور میں ہم سکون کی توقع رکھیں اور اعتدال اور میانہ روی کی تلاش اس دنیا میں کریں جس پر انتہا پسندی چھائی ہوئی ہو اور بوڑھوں اور بزرگوں کی دانائی اور حکمت پرجوش نوجوانوں میں ڈھونڈھیں، ہر انسان پر اس کے ماحول اور زمانہ کی چھاپ لگی ہوتی ہے اور ہر زمانہ اور ہر ماحول ان ہی واقعات کو اپنے لئے چھانٹ لیتا ہے جسے وہ اپنے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ ہر برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اُس کے اندر ہوتی ہے۔

نسیمِ حرّیت کے لئے کھڑکیاں کھول دو

پھر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس پُرانے اور بوسیدہ اسلوب فکر کو چھوڑ دیں، جسے انتظامیہ اور امن وسلامتی کے ذمہ داروں نے اپنا رکھا ہے۔ یہ اسلوب تشدد اور جسمانی تعذیب کا اسلوب ہے، اور آزادی کی فضا کو عام کریں، تنقید کو خوش آمدید کہیں اور دین میں نصح و خیر خواہی کی روح کو زندہ کریں اور وہی بات کہیں جو حضرت عمرؓ نے کہی، ہمیشہ خوش آمدید ہے ناصح اور خیر خواہ کے لئے۔ خیر خواہ اور ناصح کے لئے صبح وشام خوش آمدید ہے۔ اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جو مجھے میرے عیبوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ اسلوب تھا حضرت عمرؓ کا، اسی طرح وہ اپنے خیر خواہوں، مشورہ دینے والوں اور اپنے اوپر تنقید کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور تائید کرتے تھے۔

ایک بار ایک آدمی نے حضرت عمرؓ سے کہا، امیر المومنین اللہ سے ڈریئے۔ مجلس کے بعض لوگوں نے اس کی اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو آپؓ نے

فرمایا۔ چھوڑ دو اسے۔ تمہارے اندر کوئی بھلائی نہ رہے گی جب تم یہ بات کہنا چھوڑ دو گے اور اگر ہم اسے سُننا چھوڑ دیں تو ہمارے اندر بھی کوئی بھلائی نہیں رہ جائے گی۔

ایک دن حضرت عمرؓ نے خطبہ دیتے ہوئے کہا: اے لوگو! تم میں سے جو شخص بھی میرے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھے تو اسے چاہیئے کہ وہ مجھے سیدھا کر دے۔ آپؓ کی بات سُن کر ایک آدمی نے کہا۔ خدا کی قسم اگر ہم تمہارے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھیں گے تو ہم اپنی تلواروں کی دھار سے اسے سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ اس کی بات سُن کر نہ غصّہ ہوتے، نہ اسے گرفتار یا نظر بند کرنے یا تحقیق کرنے کا کوئی حکم دیا، بلکہ خوشی اور اعتماد کے ساتھ فرمایا۔ حمد اللہ ہی کے لئے ہے جس نے مسلمانوں میں ایسے فرد کو بنایا جو عمر کی ٹیڑھ کو اپنی تلوار کی دھار سے درست کرنے کا عزم رکھتا ہے۔

آزادی کی فضا ہی میں افکار اُجالے میں آتے ہیں، اسی فضا میں اہلِ علم ان پر بحث مباحثہ کرتے ہیں، تنقیدی روشنی ڈالتے ہیں پھر صحیح افکار کو بقا اور دوام مل جاتا ہے، غلط افکار ذہنوں سے اوجھل اور ختم ہو جاتے ہیں یا پھر ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جب یہ افکار تہہ خانوں کی تاریکی میں پڑے رہتے ہیں اور بحث و مباحثہ اور تنقید کے بغیر ان کو قبول کر لینے کی تلقین کی جاتی ہے تو معاملہ دن بدن بگڑتا جاتا ہے، یہاں تک کہ لوگ اس نوزائیدہ اور نامانوس فکر سے گھبرا جاتے ہیں۔

ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ "فکر" ہی اس انتہا پسندی کا مصدر و منبع ہے، لہٰذا اس کا علاج بھی فکر ہی سے ہونا چاہیئے، زبانوں سے نکلنے والے الفاظ کا مقابلہ نیزے کی انی سے نہیں کیا جاتا ہے، قلم کی کاٹ قلم سے کی جاتی ہے اور شُبہ کا مقابلہ دلیل اور حجت سے کیا جاتا ہے۔

انتہا پسندوں کو کھدیڑنے اور ان کی فکر کو ختم کرنے کے لئے طاقت اور قوت کا سہارا لینا بہت بڑی غلطی ہے دھر پکڑ سے انتہا پسندانہ فکر کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ روپوش ہوکر زندہ رہتی ہے، جیسے آگ ماچس میں چھپ کر باقی رہتی ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے بگڑے ہوئے ذہنوں کو درست کرنے کے لئے بات چیت کی راہ اپنائی جائے، اچھے ڈھنگ اور اسلوب سے گفتگو کا طویل سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ بات صاف اور واضح ہو جائے اور ہر دیکھنے والی آنکھ کے لئے راستی کی صبح روشن ہو جائے یہاں تک کہ اگر وہ ہتھیار اٹھائیں تو ضروری ہے کہ ان ہتھیاروں کی مار کا انھیں نشانہ بنانے کے بجائے وہ ہتھیار ان سے لے لئے جائیں۔

اب رہے وہ انقلابی نظریات کے علم بردار —— انتظامیہ اور جاسوسی شعبوں کے افراد جو اعلان کرتے رہتے ہیں کہ انتہا پسندوں کی ہڈیوں تک کو پیس دینا چاہئے۔ سزا دے کر انھیں مار ڈالنا چاہئے، ان کا ایک فرد بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ تو تشدد کی ان راہوں سے یہ لوگ انتہا پسندی کو ختم نہیں کر سکتے بلکہ اس کے شعلوں کو اور بھڑکا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انتہا پسندی کے پروں کو تھوڑی دیر کے لئے کاٹ دیں لیکن پھر بہت جلد ہی یہ پر نکل آتے ہیں اور انتہا پسندی کا پرندہ فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ اور اگر کسی انتہا پسند گروہ کے ایک ایک فرد کو ختم کرنے میں یہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسی وقت اپنے اس عمل سے وہ ایسے ایک نہیں بہت سے گروہوں کے وجود میں آنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جو انتہا پسندی اور تشدد میں پہلے گروہ سے بہت آگے ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں یہ اولین ذمہ داری ہے کہ ایک صالح اور ایسا صاف ستھرا

اسلامی ماحول بنانے کی کوشش کی جائے جس کی بنیاد روشن فکری اور صحیح فقہی بصیرت پر ہو ایسی روشن فکری اور فقہی بصیرت جو سطح پر رک جانے کے بجائے گہرائیوں میں اتر جائے اور چھلکوں میں الجھنے کے بجائے مغز کو پالے۔ ایسی فقہی بصیرت جو فروع کو اصول، جزئی کو کلی اور ظنی کو قطعی کی طرف لوٹائے اور احکام کو ذیلی اور فروعی شاخوں سے حاصل کرنے کے بجائے اس کے اصل ماخذ اور منبع سے حاصل کرے۔ ایسی اسلامی فضا کا بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان جب کسی فکر و خیال کو اپنا لیتا ہے۔ اس کی صحت پر چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔ یقین کرنے لگتا ہے تو اسے اس فکر سے ہٹانا ایک صبر آزما کام ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے پر خلوص کوشش صبر جمیل اور اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

ارباب اقتدار نے یہ خیال کر لیا ہے یا ان کے ذہنوں میں خیال ڈالا گیا ہے کہ یہ کام بڑا سہل ہے، بہت ہی آسان ہے اور بہت جلد اسے انجام دیا جا سکتا ہے بس اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ نشریاتی ذرائع اور وسائل، ریڈیو ٹیلی ویژن اور صحافت سے منظم ڈھنگ سے کام لینا ہوگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دل و دماغ میں تبدیلی آجائے گی، لوگوں کا رخ بدل جائے گا لوگ مشرق سے مغرب کی طرف گھوم جائیں گے دائیں سے بائیں مڑ جائیں گے۔

لیکن یہ لوگ بھول گئے یا جان کر انجان بن گئے کہ مطلوبہ تبدیلی لانے اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کے سلسلہ میں اقتدار کی زبان و قلم اور نشریاتی ذرائع سب سے زیادہ ناکام رہتے ہیں، ان کی باتیں اپنے اسلوب اور روح کے ساتھ لوگوں کے لئے عام طور ناقابل تسلیم ہوتی ہیں اور وہ اسے رد کر دیتے ہیں۔

بعض ملکوں میں اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ زندانیوں کی ذہنی

تربیت اوران کے دماغوں کی دھلائی کے لئے علمار اور مقررین کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن ان کوششوں سے رتی برابر فائدہ نہیں ہوا بلکہ یہ علمار اور مقررین اوران کے مواعظ و خطبات تمسخر کا نشانہ بن گئے۔

یہ مطلوبہ فکری اور فقہی بصیرت انھیں علمار کے ذریعہ پیدا ہوسکتی ہے جواقتدار کے اثرات سے دور ہوں اوران نوجوانوں کا انھیں اعتماد بھی حاصل ہو۔ ان کے علم پر اوران کی دینداری پر اعتماد ہو اور یہ چیز آزاد اور فطری ماحول میں حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ آزاد ماحول، سنہری دعاوں، دھمکی کے کوڑوں اور جیل کی چہار دیواری سے دور ہوتا ہے، پھر یہ ذہنی تبدیلی اوپر کے احکام وتلقین اور عسکری فرمان سے ایک صبح وشام میں نہیں پیدا ہوسکتی — اس کی تکمیل کے لئے ایک مدت مدید تک آزادانہ ملاقاتوں، تعمیری بات چیت اور تبادلۂ خیالات کے سلسلہ کو جاری رکھنا ہوتا ہے۔

تکفیر کا مقابلہ تکفیر سے نہیں کرنا چاہئے

سب سے زیادہ اندیشہ اور خطرہ کی بات یہ ہے کہ ہم فکری انتہا پسندی کا مقابلہ فکری انتہا پسندی سے کریں۔ اس سے ہمیں بچنا چاہئے ورنہ پھر ہمیں تعصب کا تعصب سے، انکار کا انکار سے اور برائی کا برائی سے سامنا کرنا پڑے گا اور اس میدان میں جیسا کہ کہا گیا ہے پہل کرنے والا ہی ظالم ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ کی یہ بات بھی ہے کہ ہم ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ نہ لگائیں، جن لوگوں نے دوسرے لوگوں کی تکفیر کی ہے جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں جس نے ہمیں کافر کہا ہم بھی اسے کافر کہیں گے اور کچھ لوگ اس سلسلہ میں اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

من کفر مسلما فقد کفر۔ جس نے مسلمان کی تکفیر کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اگر ہم بھی یہی کچھ کریں گے تو ہم بھی اسی گڈھے میں گر جائیں گے جس میں تکفیر کرنے والے پہلے سے گرے ہوئے ہیں اور اس حدیث کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا جو کسی کی تکفیر کسی تاویل یا شبہ کی بنیاد پر کرتا ہے جیسا کہ صحیح احادیث اور ان ثابت شدہ واقعات سے ہوتا ہے جن کا تعلق صحابہ کرام رض سے ہے۔

ہمارے لئے حضرت علی رض کی زندگی بہترین نمونہ ہے خوارج حضرت علی رض سے برسر جنگ تھے اور ایک عام مسلمان پر جو بدترین تہمتیں لگائی جاسکتی ہیں، خوارج نے وہ تہمتیں حضرت علی رض پر مسلمانوں کے سردار پر، اسلام کے شہ سوار پر ــــ فاطمہ رض کے شوہر پر، رسول اللہ ص کے چچازاد بھائی پر، حق کی نیام سے باہر آئی ہوئی تلوار پر لگائیں لیکن اس کے باوجود حضرت علی رض نے ان کے سلسلہ میں کیا موقف اپنایا؟ ان کے باطل کی تردید کی، لیکن ان کی تہمتوں کے جواب میں تہمت تراشی نہیں کی۔ خوارج نے حضرت علی رض کی تکفیر کی تھی لیکن آپ رض نے ان کی تکفیر نہیں کی، بلکہ حسن ظن سے کام لے کر انہیں دائرہ اسلام میں باقی رکھا۔ بعض لوگوں نے خوارج کے سلسلہ میں آپ رض سے پوچھا، کیا یہ لوگ (خوارج) کافر ہیں؟ آپ رض کا جواب تھا۔ کفر سے تو یہ لوگ بھاگے ہیں ... کہا گیا، پھر یہ کون ہیں؟ آپ رض نے جواب دیا کل یہ ہمارے بھائی تھے آج یہ ہمارے خلاف بغاوت کر رہے ہیں، ایسی حالت میں ان پر باغی کا حکم لگایا جائے گا، مرتد کافر کا نہیں! باغی وہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی تاویل یا شبہ کی بنیاد پر امام عادل کے خلاف خروج کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس طاقت و شوکت ہوتی ہے تو ہتھیار لے کر یہ امام کے مقابلہ میں آجاتے ہیں، ایسی حالت میں ان سے جنگ کرنے میں امام کو جلدی نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کے پاس ایسے شخص کو بھیجنا چاہئے جو ان کے شبہ کو دور کردے، ان پر حجت قائم کردے اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ان کو خوں ریزی سے بچانے کے لئے بطریق احسن گفت و شنید کرے۔

لیکن اگر ان کوششوں کے باوجود باغی اپنے موقف پر اصرار کرتے ہیں اور جنگ کے علاوہ اور کسی بات پر تیار نہیں ہوتے ہیں تو ان سے جنگ کی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئیں، لیکن اس جنگ میں ان کے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ ان کے زخمیوں پر حملہ کر کے مارا نہیں جائے گا۔ ان کے قیدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کی عورتوں کو باندی نہیں بنایا جائے گا۔ ان کے اموال کو غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان سے جنگ ان کی اذیتوں سے بچنے اور اسلامی دعوت کی طرف ان کو واپس لانے کے لئے کی جاتی ہے انھیں تباہ و برباد کرنے کے لئے نہیں!

پھر اگر یہ باغی اپنے ہاتھوں کو روک لیں، معروف میں اطاعت کا اعلان کر دیں، تو ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اگرچہ ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو اس لئے کہ رائیں نہ جنگ سے بدلی جاتی ہیں اور نہ تلوار کے زور سے لوگوں پر تھوپی جاتی ہیں۔

آزادی رائے کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کا ایک اور موقف بھی یہاں سامنے آتا ہے یہ موقف اس لائق ہے کہ اس کی بھرپور اشاعت کی جائے۔ یہ موقف اس بات کی دلیل ہے کہ آغاز اسلام ہی سے لوگوں کو خاص طور سے اپوزیشن کو آزادی رائے کا بھرپور حق حاصل رہا ہے۔ دنیا اس منزل تک صدیوں بعد پہنچی۔

حضرت علیؓ جب پنچوں کا فیصلہ ماننے پر راضی ہو گئے تو خارجیوں نے آپ پر اعتراض کیا اور کہا لاحکم الا اللہ، فیصلہ تو اللہ ہی کا مانا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اپنے بلیغ تاریخی جواب میں کہا:

کلمۃ حق ارید بہا الباطل　　　بات سچی ہے مگر مقصد باطل ہے

خارجیوں کی اس کھلی ہوئی مخالفت کے باوجود آپؓ نے صریح اور واضح الفاظ

میں ان سے کہا۔

ہم پر تمھارے تین حق ہیں۔ یہ کہ ہم تمہیں مسجدوں سے نہ روکیں، تمھارا وظیفہ نہ بند کریں۔ اور جب تک تم لوگ شر و فساد برپا کرنے سے رکے رہو تب تک تم سے کوئی جنگ نہ کریں۔

اس طرح آپؓ نے خارجیوں کو یہ ضمانت دی کہ مسلمانوں کی مسجدوں میں انھیں عبادت کی آزادی حاصل رہے گی اگرچہ یہ خارجی عام مسلمانوں سے رائے میں اختلاف رکھتے تھے۔ آپؓ نے انھیں یہ ضمانت بھی دی کہ خراج سے انھیں وظیفہ ملتا رہے گا۔ اور ان سے جنگ نہیں کی جائے گی جب تک کہ ان کی طرف سے شر و فساد برپا کرنے کی کوشش اور جارحیت کا ارتکاب نہ ہو۔

یہ ضمانت خارجیوں کو اس وقت دی گئی جب کہ ان کا ہر فرد تربیت یافتہ مسلح فوجی تھا جنگ کی قدرت رکھتا تھا اور اس وقت کے ظروف و احوال کے پیش نظر کسی وقت بھی وہ جنگ کے شعلوں کو بھڑکا سکتا تھا۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عام علمائے محققین نے خارجیوں کی تکفیر سے پرہیز کیا ہے جب کہ خارجیوں کو اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں کی تکفیر پر اصرار تھا۔ یہ ان کے جان و مال کو مباح سمجھتے تھے، ان کے خلاف ہتھیار اٹھاتے تھے اسی کے ساتھ ساتھ وہ صحیح حدیثیں بھی ہیں جن میں ان کے دین سے نکل جانے کی بات کہی گئی ہے اور ان سے جنگ کرنے اور قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔

امام شوکانی نے اپنی کتاب 'نیل الاوطار' میں کہا ہے۔

علمائے اہل سنّت کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ خارجی مسلمان ہیں اور چونکہ وہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہیں، ارکان اسلام کی پابندی کرتے ہیں، اس لئے ان پر اسلام کا حکم

جاری ہوگا، مسلمانوں کی تکفیر ان لوگوں نے غلط تاویل کی بنیاد پر کی ہے، اسی غلطی نے انھیں اس موقف میں پہنچا دیا کہ اپنے مخالفوں کے کفر و شرک کا اعلان کر کے ان کی جان و مال کو مباح سمجھنے لگے ہیں۔

خطابیؒ کا کہنا ہے کہ علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خارجی اپنی گمراہیوں کے باوجود مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہیں، علماء نے ان کے ساتھ شادی بیاہ کو جائز اور ان کے ذبیحہ کا کھانا حلال قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک یہ خارجی اسلام کی بنیاد سے وابستہ ہیں تب تک ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

عیاضؒ کا کہنا ہے کہ متکلّمین کے نزدیک یہ مسئلہ سب سے مشکل مسئلہ رہا ہے۔ فقیہ عبدالحق نے امام ابوالمعالی سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا، کسی کافر کو ملّت میں داخل کرنا یا کسی مسلمان کو ملّت سے خارج کر دینا۔ دینی نقطہ نظر سے بہت بڑی اور عظیم بات ہے۔ نیز فرمایا۔ قاضی ابوبکر الباقلانی نے بھی اس مسئلہ میں توقف فرمایا اور کہا ان لوگوں نے کفر کا اعلان نہیں کیا ہے بلکہ ایسی باتیں کہی ہیں جو کفر تک پہنچاتی ہیں۔

غزالی نے اپنی کتاب "التفرقہ بین الایمان والزندقہ" میں کہا ہے۔ جب تک کوئی راہ ملے ان کی تکفیر سے احتراز کرنا چاہیے۔ توحید پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کے خون کو مباح قرار دینا غلطی ہے، کفر کے سلسلہ میں ایک ہزار آدمی کو زندہ باقی رکھنے میں غلطی کر جانا۔ زیادہ ہلکا جرم ہے اس بات سے کہ کسی مسلمان کے خون کو غلطی سے مباح قرار دے کر اسے قتل کر دیا جائے۔

ابن بطال نے کہا ہے کہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ خارجی مسلمانوں میں شامل ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت علیؓ سے نہروان والوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ جو خارجی تھے، کیا ان لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا۔ یہ لوگ کفر سے

بھاگے ہیں۔

اسی قول کے مطابق ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی لیکن جب یہ لوگ تمرد اور سرکشی کی راہ اپنا کر جنگ کے شعلوں کو بھڑکائیں گے تو ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ تکفیر کی راہ خطرناک راہ ہے اس سے محفوظ اور سلامت رہنا سب سے بڑی بات ہے۔

نوجوانوں کی ذمہ داری

نوجوانوں کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو درست کریں اور اپنے افکار کو صحیح رخ دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے دین کو بصیرت کے ساتھ جان لیں اور اسے دلائل سے سمجھ لیں اس فہم مطلوب کے لئے نقطۂ آغاز یہ ہو سکتا ہے کہ فہم اسلام کے لئے ایسا راستہ اور اسلوب اپنایا جائے جو نقائص سے پاک ہو اور اسی کو زندگی اور لوگوں کے ساتھ باہمی معاملات کی بنیاد بنایا جائے۔

اسی لئے علمائے امت نے ایسے ضروری قواعد و ضوابط کو وضع کر دیا جو اسلام کو اچھی طرح سمجھنے اور بہتر ڈھنگ سے مسائل کے استنباط کے لئے ضروری ہے خواہ یہ استنباط منصوص سے ہو یا غیر منصوص سے۔

یہیں سے تدوین فقہ کے لئے فن "اصول فقہ" کا آغاز ہوا۔ فقہ سے مراد وہ اسلامی اسلوب فکر ہے جسے اپنا کر تفصیلی دلائل سے عملی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے اسی لئے اس میں حکم، حاکم، محکوم بہ اور محکوم علیہ بنیادی اور اصلی دلائل، فروعی دلائل، امر، نہی، خاص، عام مطلق، مقید، منطوق و مفہوم کے ساتھ ساتھ مقاصد شریعت۔ رعایت مصالح، ازالہ مفاسد کے موضوعات پر علماء نے بحث کی ہے پھر مصالح کو ضروری اور غیر ضروری اقسام میں تقسیم کیا۔ مختصر یہ کہ اس فن کی مختلف تصنیفات میں اس فن سے

متعلق مختلف موضوعات اور عناوین پر بھرپور بحث کی گئی ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ اس بے مثال فن پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں دوسری قوموں کے پاس اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ اس موضوع سے متعلق کچھ قواعد وضوابط ایسے بھی ہیں جو اصول فقہ کی کتابوں کے بجائے ان کتابوں میں منتشر طور پر پائے جاتے ہیں جن کا تعلق اصول تفسیر، علوم قرآن علوم حدیث اور اصول حدیث سے ہے، اسی طرح کچھ قواعد وضوابط ایسے ہیں جو منتشر طور پر محققین کی کتابوں میں، عقائد و تفسیر کی کتابوں میں، شرح حدیث اور فقہ اور دوسرے فنون کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو دینی اور شرعی علوم میں بصیرت حاصل ہے، وہ ان قواعد وضوابط پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

پھر تو اہم بات یہ ہے کہ اللہ کے دین کا صحیح فہم حاصل ہو لیکن یہ صحیح فہم آیات و احادیث اور ان کے اسرار و مقاصد پر گہرے تدبر و تفکر کے بجائے سرسری مطالعہ نصوص پر سطحی اور اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے نہیں حاصل ہوتا، اس کے لئے صحیح اور درست راہ اپنانی پڑتی ہے دین کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی نئی اور ابھرتی ہوئی نسل کو چند باتوں پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔

جزئی مسائل کلیات کی روشنی میں

اوّلاً! شریعت سے علم و آگاہی کی تکمیل، مختلف، بکھرے ہوئے جزئی مسائل کے جاننے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ فروع کو اصل، جزئیات کو کلیات، متشابہات کو محکمات اور ظنیات کو قطعیات کی طرف لوٹایا جائے تاکہ ان کے اندر پائی جانے والی ہم آہنگی واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں،

ان کا تانا بانے سے اور آغاز انتہا سے ملا ہوا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کسی کو ایک آیت یا ایک حدیث کی کوئی نص مل جائے اور بظاہر اس سے کوئی حکم بھی ثابت ہوتا ہو، تو وہ دوسری حدیثوں کو، سیرت نبویؐ، سیرت صحابہؓ کو نظر انداز کر کے اس حکم کو ثابت کرے یا اسے قرآنی اصولوں کی طرف لوٹانے اور شریعت کے مقاصد عامہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو مفہوم خلل سے اور استنباط اضطراب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس طرح شریعت کا ایک حکم دوسرے حکم سے ٹکرائے گا اور شریعت مخالفوں کے طنز و تمسخر کا نشانہ بن جائے گی۔

اسی لئے امام شاطبی نے اپنی کتاب "الموافقات" میں اجتہاد کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مجتہد کے لئے شریعت کے مقاصد اور کلیات سے آگاہ ہونا ضروری ہے آپ نے فرمایا۔ اجتہاد کا درجہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے اندر دو وصف پائے جائیں۔

اوّل: شریعت کے اعلیٰ مقاصد کی فہم۔

ثانی: اس فہم کی بنیاد پر استنباط مسائل کی قدرت و صلاحیت۔

اور یہ خوبی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نصوص پر خصوصاً احادیث اور آثار پر نیز ان کے اسباب اور مطلوبہ مقاصد پر وسیع اور گہری نگاہ ہو اور یہ جاننے کی صلاحیت ہو کہ ان میں کون سا حکم ابدی ہے اور کس کی بنیاد عرف عامہ اور وقتی حالات یا کسی خاص اور متعین مصلحت پر ہے اور اس میں عرف، وقتی حالات اور مصلحت کے بدلنے سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔

ایک بار ایک سمپوزیم میں میں مسلمان عورت کے شرعی لباس پر کتاب و سنّت کی روشنی میں گفتگو کر رہا تھا تو ایک شخص نے کہا۔ عورت کے لباس میں جلباب کا ہونا

ضروری ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ڈھک لے۔

میں نے کہا۔ جلباب فی نفسہ مقصود نہیں ہے بلکہ اہم بات دبیز ساتر لباس ہے جو جسم کے ہر اس حصّے کو چھپالے جسے اللہ نے چھپانے کا حکم دیا ہے، چاہے اس کا نام اور شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وسیلہ ہے جو حالات اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہے گا۔

لیکن اعتراض کرنے والے شخص نے پرجوش اور غضبناک لہجہ میں کہا، لیکن یہ ایک ایسا وسیلہ اور ذریعہ ہے جس پر قرآن پاک کی نص موجود ہے:

يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکالیا کریں (الاحزاب ۵۹)

اور ہمیں یہ حق نہیں کہ اس کو ہم کسی اور چیز سے بدل دیں

میں نے کہا: قرآن پاک میں کبھی کبھی بعض ایسے وسائل و ذرائع کی نشاندہی کی جاتی ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور انھیں استعمال کیا جاتا تھا لیکن یہ نشاندہی اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ اس کا اپنانا ہمیشہ ہمیش کے لئے لازم ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جب اسی طرح کے یا اس سے بہتر ذرائع پائے جائیں تو اس کو چھوڑ کر ان نئے ذرائع اور وسائل کے اپنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک مثال بیان کر دینا کافی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)

اور تم لوگ جہاں تک تمھارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو تاکہ ان کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں ... کو خوف زدہ کر دو۔

اس آیت میں رباط الخیل کے لئے نص موجود ہے اس لئے کہ نزول قرآن کے

وقت یہ جنگی نقطۂ نظر ایک معروف اور قوی ذریعہ تھا لیکن ہم سے پہلے یا ہمارے دَور کے مسلمانوں کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر ٹمینک اور بکتر بند گاڑیوں وغیرہ کو اپنائیں جب کہ اس سے وہ مقصد پورا ہو رہا ہو جس کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے اللہ اور مسلمانوں کے دشمنوں کو خوف زدہ کرنا۔

یہی بات جلباب پہننے کے سلسلہ میں بھی کہی جا سکتی ہے اسے بھی کسی دوسرے لباس سے بدلا جا سکتا ہے جب کہ اس سے وہ مقصد پورا ہو جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے :

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ

یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔

(الاحزاب - ۵۹)

پھر اگر اس طرح کی باتیں اس قرآن پاک میں پائی جاتی ہیں جس پر عمومیت اور ابدیت کی چھاپ ہے تو سنّت میں تو اور زیادہ پائی جا سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اس میں کچھ تشریعی ہیں اور کچھ غیر تشریعی۔ کچھ کا تعلق تشریع خاص سے ہے تو کچھ کا تشریع عام سے کچھ ابدی ہیں اور کچھ اسباب و موجبات کے بدلنے سے بدل سکتی ہیں۔

مثلاً یہی کھانے پینے اور پہننے کا مسئلہ ہے اس میں ہمیں تشریعی سنّتیں بھی ملتی ہیں اور غیر تشریعی بھی، میرے خیال میں چمچہ وغیرہ کے استعمال کے بغیر ہاتھ سے کھانا کھانے کا تعلق سنن غیر تشریعی سے ہے، عربوں کی یہی عادت تھی اور یہی ان کا طریقہ تھا اور یہی بات ان کی فطرت اور ان کی سادہ زندگی سے زیادہ قریب تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چمچہ سے کھانا، بدعت، حرام یا مکروہ ہے خصوصاً جب کہ یہ وسائل تمام لوگوں کو میتسر ہوں اور ان کا استعمال اسراف اور عیش پسندی کی علامت نہ ہو، جیسا کہ سونے چاندی کے چمچوں اور برتنوں کا معاملہ ہے کہ اسلام نے ان میں کھانے پینے کو حرام

قرار دیا ہے۔

اس کے برخلاف داہنے ہاتھ سے کھانے پینے کی بات ہے تو اس کا تشریعی پہلو واضح ہے، اس لئے اس کی پابندی کا حکم آیا ہے حدیث میں ہے

سمِ اللہ وکل بیمینک بسم اللہ کہہ کر داہنے ہاتھ سے کھاؤ (البخاری ومسلم)

اور اس حکم کی مخالفت کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

لایاکل احدکم بشمالہ ولایشرب بشمالہ فان الشیطان یاکل بشمالہ ویشرب بشمالہ

تم میں کسی کو نہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا چاہیے نہ پانی پینا چاہئے اس لئے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے (مسلم)

اور اس تشریعی سنّت کا مقصد یہ ہے کہ ایسے مشترکہ اسلامی اخلاق وآداب کی نشوونما ہو جو اپنے رخ اور رویّہ میں ممتاز ہو اور اس رخ کی جھلک اس بات سے بھی نمایاں ہوتی ہے کہ تیامن (ہر کام کو داہنے سے آغاز کرنے) کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح غیر تشریعی سنّت سے اس بات کا تعلق بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں مسلمان چھلنی سے آگاہ نہیں تھے اور آٹے کو بھوسی کے ساتھ گوندھ کر پکاتے تھے۔ پھر بعد کے دور میں چھلنی سے واقف ہوئے اور اسے استعمال بھی کرنے لگے تو کیا یہ چھلنی کا استعمال ان بدعتوں میں ہے جسے حرام قرار دیا گیا ہے یا مکروہ ہے ...؟ ہرگز نہیں ...

اسی ضمن میں ثوب قصیر کی بات بھی آتی ہے۔ دین پسند نوجوان اس کی پابندی کرتے ہیں اور اس کے پہننے پر اصرار بھی کرتے ہیں چاہے اس کے باعث انھیں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے گویا وہ اسلام کا ایک شعار اور لازمی فریضہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لباس

یہی تھا اور دوسرے لباس میں کفار سے مشابہت ہوتی ہے اور جو شخص جس قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے اس کا شمار اسی قوم میں ہوگا، اب رہی اس کے قصیر یا ٹخنوں سے اوپر ہونے کی بات تو یہ لوگ ان حدیثوں سے دلیل لاتے ہیں جن میں اسبال ازار سے منع کیا گیا ہے

وما أسفل من الكعبين من الازار فهو في النار

ازار کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا تو وہ جہنم میں ہوگا

اب رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل سے لباس پر دلیل لانے کی بات تو آپؐ کی سیرت سے یہ ثابت ہے کہ جو لباس آسانی سے آپؐ کو حاصل ہو جاتا تھا اسے آپؐ پہنتے تھے، آپؐ نے کرتا بھی پہنا ہے اور لنگی بھی، آپؐ نے عام چادر بھی استعمال کی ہے اور یمنی چادر بھی، آپؐ نے وہ جبہ بھی زیب تن فرمایا ہے جس کی آستینوں پر ریشمی کام تھا، ان کے علاوہ ان کپڑوں کو بھی آپؐ نے استعمال فرمایا جو آپؐ کے زمانے میں رائج تھے اور جو آسانی سے مل جاتے تھے، اسی طرح آپؐ نے ٹوپی کے اوپر عمامہ باندھا ہے اور کبھی بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی ہی استعمال کی۔

امام ابن القیمؒ نے لکھا ہے:

"سب سے افضل راہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہ ہے۔ جسے آپؐ نے مقرر کیا اور اسے اپنانے کا حکم دیا، اس کی طرف لوگوں کو راغب کیا اور خود آپؐ نے اس پر مداومت برتی، لباس کے سلسلہ میں آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جو لباس آپؐ کو مل جاتا تھا اسے آپؐ پہنتے تھے۔ کبھی آپؐ نے اونی لباس استعمال کیا تو کبھی سوتی اور کتان کا، آپؐ نے یمنی اور سبز چادریں بھی استعمال کی ہیں، آپؐ نے جبہ، قبا، کرتا، پائجامہ، چادر، موزہ اور جوتا بھی پہنا ہے۔ عربوں میں کتائی بنائی کا عام رواج نہ تھا مصر، شام اور یمن سے جو لباس اور کپڑا آتا تھا اسی کو وہ لوگ پہنتے تھے۔

آج بھی ہم بہت سی ایسی چیزیں پہنتے ہیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رواج نہ تھا۔ ہم جن چیزوں سے اپنے سروں کو ڈھکتے ہیں وہ ان کے استعمال میں نہیں تھیں جو جوتا اور موزہ آج ہم استعمال کرتے ہیں اس دور میں نہیں پہنا جاتا تھا لیکن ان چیزوں میں کسی کو کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ صرف ثوب قصیر ہی کے سلسلہ میں یہ سختی کیوں؟

اب رہی غیر مسلموں سے مشابہت کی بات تو اس سلسلہ میں وہی چیزیں ممنوع ہیں جو ان کے دینی تشخص کو نمایاں کرتی ہیں مثلاً صلیب کا پہننا یا کاہنوں کے مخصوص لباس کا پہننا عیسائیوں کی خصوصیت ہے اور ان کے استعمال سے عیسائیوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ان کے دینی تہواروں کو منانے کی بات بھی ہے، امام ابن القیمؒ نے اپنی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اہل الجحیم" میں ان چیزوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ان نمایاں اور مخصوص چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کا دارومدار نیت اور ارادہ پر ہے، اب اگر کوئی شخص کسی چیز کا استعمال غیر مسلموں سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے تو اس سے اس کی نیت اور ارادے کے مطابق آخرت میں بازپرس ہوگی، لیکن جس کے دل میں مشابہت کا خیال بھی نہیں آتا، بلکہ اگر وہ کسی لباس کو اپنے ماحول کے لحاظ سے باسانی حاصل ہونے کی وجہ سے یا اس خیال سے استعمال کرتا ہے کہ وہ اس کے پیشے اور کام کے لئے زیادہ مناسب ہے، جیسے کارخانوں میں کام کرنے والے یا انجینئر وغیرہ استعمال کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے۔

لیکن اس کے باوجود بہر حال یہ بات پسندیدہ ہے کہ جب تک کوئی راہ ملے

مسلمان کو اپنی زندگی کے تمام مادی اور معنوی معاملات میں دوسروں سے ممتاز رہنا چاہیئے۔

ثوب قصیر، یا ٹخنوں سے اونچا لباس پسندیدہ اور مستحب ہے لیکن اس کا لمبا ہونا حرام نہیں ہے جب کہ وہ عادتاً ہو اور اس میں تکبّر کا کوئی شائبہ نہ پایا جاتا ہو۔

ابھی تک جن مثالوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق افراد اور اشخاص سے ہے اور یہ ایک گونہ آسان بات ہے لیکن جب اس شدت پسندی کا تعلق پورے سماج، حکومت اور بین الاقوامی تعلقات سے ہو تو معاملہ اتنا آسان نہیں رہ جاتا اور یہیں سماج، ملک اور انسانیت کے لئے خطرہ پوشیدہ رہتا ہے جب کہ سماج کو وہ روشن فکری حاصل نہ ہو جس سے انسانی ضروریات اور اجتماعی مصالح کی صحیح صحیح قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔

پس ایسی حالت میں جب ہم دعوت دیتے ہیں کہ از سر نو حقیقی اسلامی زندگی کا آغاز ہونا چاہیئے اور اسی کی بنیاد پر ایک ایسا مکمل اسلامی سماج بننا چاہیئے جس کی قیادت اور سربراہی کا فریضہ عصر حاضر کا ایک ایسا اسلامی اسٹیٹ انجام دے گا جس کے تعلقات اسی دنیا سے ہوں گے جہاں الجھے ہوئے تعلقات اور الگ الگ راہوں کے باوجود مسافتیں سمٹ آئی ہیں۔ رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔ یہاں تک کہ آج یہ پوری دنیا ایک شہر کے مانند ہو گئی ہے ... مزید برآں ہمیں اس حقیقت کا بھی ادراک کرنا چاہیئے کہ سماج میں توانا اور کمزور، مرد اور عورت، بچے اور بوڑھے، شدت پسند، معتدل مزاج اور بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہر طرح کے لوگ رہ رہے ہیں، پھر تو ہمارے لئے رہنمائی، مسائل کے بیان کرنے اور قانون سازی کے سلسلہ میں ان تمام لوگوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی فرد اپنے اوپر سختی کو لازم قرار دے لے، اپنے عمل کے لئے احتیاط کے طور پر وہ ان رایوں کو اپنا لے جن میں شدت پائی جاتی ہے وہ اپنے آپ کو لہو لعب، موسیقی، نغمہ، تصویر، فوٹو گرافی، ٹیلی ویژن وغیرہ ہر چیز سے محروم کر سکتا ہے

لیکن کیا عصرِ حاضر کی کوئی حکومت بھی اس بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے اور کیا کوئی صحافت جس کا آج کی دنیا میں وزن ہو بغیر تصویر کے وجود میں آسکتی ہے اور کیا آج کے دور میں وزارت داخلہ، وزارت خارجہ، پاسپورٹ کا محکمہ تحقیقات اور ٹریفک کا شعبہ، مدرسے اور یونیورسٹیاں تصویر اور تصویر کشی سے بے نیاز ہو سکتی ہیں جب کہ یہ تصویر آج چھل اور فریب کو روکنے اور فریبیوں کو پکڑنے کا ایک اہم ترین ذریعہ بن گئی ہے۔

کیا آج کسی حکومت اور اسٹیٹ کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے دور اور زمانہ سے ان جان بن جائے اور اپنی قوم کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے محروم کر دے جو دنیا کے سارے واقعات و حادثات کو آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور آپ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے چارپائی پر لیٹے ہوئے، دائیں بائیں مڑے بغیر ان کا اس طرح مشاہدہ کرتے ہیں کہ مشرق اور مغرب میں یہ جو کچھ ہوا — وہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہوا ہے کیا آج کی کوئی مسلم حکومت ٹیلی ویژن کو رد کر کے صرف ریڈیو پر اکتفا کر سکتی ہے اس لئے کہ ٹیلی ویژن میں تصویر ہوتی ہے اور وہ آج بھی حرام ہے جیسا کہ علم دین حاصل کرنے والے ہمارے بعض بھائیوں کا خیال ہے۔

یہاں جس چیز پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذات پر سختی کرتا ہے تو اس کا یہ شخصی رویہ برداشت اور قبول کیا جا سکتا ہے لیکن جو چیز ناقابل برداشت اور ناقابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ اسے سارے سماج پر، سماج میں رہنے والے ہر گروہ اور ہر سطح کے لوگوں پر لازم قرار دے دیا جائے۔ ہمیں یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہئے، آپ کا ارشاد ہے:

"جو لوگوں کی امامت کرے، اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہئے، اس لئے کہ مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور ضرورت مند ہوتے ہیں"

اگرچہ آپ کا ارشاد نماز کے سلسلہ میں ہے لیکن اس میں ان لوگوں کی رہنمائی کیلئے دلیل موجود ہے جو زندگی کے کسی میدان میں بھی لوگوں کی قیادت کرتے ہیں۔

احکام کے مراتب اور اختلاف کے آداب

شرعی احکام کے مراتب کی جانکاری سے بعض دین دار حضرات غافل رہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ سارے احکام ثبوت کے لحاظ سے یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔ اور اسی لحاظ سے ان کے سلسلہ میں اختلاف کے جواز کی حیثیت بھی الگ الگ ہے۔

یہاں وہ ظنی احکام بھی ہیں جو اجتہاد کے دائرے میں آتے ہیں۔ ان کے مفہوم و مراد میں تعدد اور اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے خواہ یہ احکام ایسے ہوں جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو یا نص ہو لیکن وہ ظنی الثبوت یا ظنی الدلالۃ ہو یا دونوں ہی ہوں۔ عمل سے متعلق بیشتر فقہی احکام کا تعلق اسی سے ہے۔ ایسے احکام کے لئے ظنی نصوص کافی ہیں۔ ان کے برخلاف وہ احکام جن کا تعلق عقیدہ سے ہوتا ہے، تو ان کے ثبوت کے لئے یقینی اور قطعی دلائل ناگزیر ہوتے ہیں۔

اس طرح کے فروعی مسائل میں اختلاف سے کوئی نقصان یا خطرہ نہیں ہوتا بشرطیکہ یہ صحیح شرعی اجتہاد پر مبنی ہوں۔ بلکہ یہ امت کے لئے رحمت ہے شریعت میں سختی کے ساتھ نرمی اور فقہ میں وسعت ہے اس طرح کے مسائل میں صحابہ کرام رض اور تبع تابعین رح نے اختلاف کیا ہے لیکن اس سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا اور نہ ان کے بھائی چارہ اور اتحاد میں کوئی رخنہ پیدا ہوا۔

شریعت میں کچھ احکام ایسے ہیں جو کتاب وسنّت اور اجماع سے ثابت ہیں اگرچہ وہ ضروریات دین میں نہیں ہیں لیکن انھیں یقین کا مرتبہ حاصل ہے ان سے امت کی

فکری اور عملی وسعت نمایاں ہوتی ہے جو ان کی مخالفت کرتا ہے وہ سنت کی مخالفت کرتا ہے یہ فسق اور بدعت ہے اور کبھی کبھی معاملہ کفر تک پہنچ جاتا ہے

یہاں دین کے کچھ ایسے معلوم اور ضروری احکام ہیں جن کا علم ہر خاص و عام کو ہے اور جو ان کا انکار کرتا ہے اس کی تکفیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ ان کے انکار سے اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کی صراحتاً تکذیب ہوتی ہے۔

ایسی حالت میں تمام احکام کو ایک دائرہ یا مرتبہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ کسی شخص کے لئے یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ وہ ہر اس شخص پر کفر، فسق اور بدعت کا لیبل چسپاں کر دے جو کسی جزئی مسئلہ میں اختلاف رکھتا ہے اس لئے کہ وہ مسئلہ کتابوں میں پایا جاتا ہے اور طالبان علم کے حلقہ میں شہرت رکھتا ہے۔ بغیر یہ دیکھے کہ یہ مسئلہ اصولی ہے یا فروعی، نص سے ثابت ہے یا اجتہاد سے، اس کا تعلق نصوص قطعیہ سے ہے یا ظنیہ سے، یہ ضروریاتِ دین میں ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ درجہ اور حکم ہے، ایک ہی حکم سب کے لئے نہیں ہے۔

ہمارے فقہائے عظام نے کبھی کبھی بعض مسائل میں اختلاف کیا اور ایک سے بہت زائد ان کے اختلافی اقوال منقول ہیں اور کبھی کبھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مسئلہ میں وہ تمام اختلافی رائیں پائی جاتی ہیں جن کا عقلاً احتمال ہو سکتا ہے، جیسا کہ ان کی رائیں اس شخص کے بارے میں ہیں جو کسی کے دباؤ کے تحت کسی بے قصور مسلمان کو قتل کر دے، کیا قصاص اس شخص سے لیا جائے گا جس نے دباؤ کے تحت قتل کیا ہے؟ یا اس شخص سے قصاص لیا جائے گا جس نے دباؤ ڈال کر قتل کرایا؟ اس لئے کہ اس دباؤ کے تحت قاتل تو صرف ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے یا دونوں سے قصاص لیا جائیگا اس لئے کہ ایک نے براہ راست قتل کیا ہے تو دوسرے نے قاتل پر دباؤ ڈال کر قتل

کرنے پر آمادہ کیا؟ یا دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قصاص واجب نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی ایک سے تنہا قتل کے جرم کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ انھیں احتمالات کے پیش نظر فقہاء نے الگ الگ رایوں کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل ہیں۔

یہ فروعی اختلافات ان فقہی مذاہب ہی میں نہیں پائے جاتے جو مسلمانوں کے نزدیک مستند ہیں اور جن کی پیروی کی جاتی ہے بلکہ ایک ہی فقہی مذہب و مسلک کے اندر بھی فروعی مسائل میں متعدد اقوال اور روایات پائی جاتی ہیں اور ان کی ترجیح و تصحیح میں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً یہ حنبلی مذہب ہے۔ اس کی بنیاد اتباع حدیث و سنّت پر ہے لیکن اس میں بھی فروعی مسائل میں اختلافات پائے جاتے ہیں اور اسی موضوع پر بارہ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے، کتاب کا نام "الانصاف فی الراجح من الخلاف" ہے۔ بنابریں ہمارے نوجوانوں کو اس سلسلہ میں اچھی سوجھ بوجھ پیدا کرنی چاہیے اور یہ جاننا چاہیئے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن میں اختلاف جائز ہے اور وہ کیا چیزیں ہیں جن میں اختلاف جائز نہیں، ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی آگاہی ہونی چاہیئے کہ جن چیزوں میں اختلاف جائز ہے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں اختلاف کے اس آداب سے بھی آگاہ ہونا چاہیئے جس کے ہم وارث ہیں، یہ وراثت ہمیں ائمہ عظام اور علماء کرام سے ملی ہے۔ ہمیں ان ائمہ اور علماء سے یہ سیکھنا چاہیئے کہ جو دین کے فروعی مسائل میں ہم سے اختلاف رکھتا ہے ہمارے سینے اس کے لئے تنگ نہیں ہونے چاہئیں۔ فروعی مسائل میں ہمارے اختلافات کو دلوں کا اختلاف نہیں بننا چاہیئے۔ ہمیں یہ سیکھنا چاہیئے کہ کیسے ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی رائے سے اختلاف کرتا ہے لیکن اسلامی اخوت پر اس اختلاف کا اثر نہیں پڑتا اور نہ اس اختلاف

کی وجہ سے محبت اور احترام میں کمی آتی ہے۔ چہ جائیکہ اختلاف کرنے والے کی عقل، علم اور دین پر تہمت لگائی جائے۔

ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ فروعی مسائل میں اختلاف ایک حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے کوئی دور کرسکتا ہے۔ یہ اللہ کی عظیم حکمت ہے کہ اس نے کچھ ایسے احکام دیئے ہیں جو اپنے ثبوت میں قطعی اور یقینی ہیں اور ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں اور اسی نے وہ احکام بھی دیئے ہیں جو ظنی الثبوت ہیں اور ان میں اختلاف کی کافی گنجائش ہوتی ہے اسلام میں ایسے علماء ہوئے ہیں جنھیں اللہ نے متنازع اقوال کی تحقیق اور ترجیح کی صلاحیت سے نوازا تھا۔ مثلاً امام ابن دقیق العیدؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن القیمؒ امام ابن کثیرؒ، امام ابن حجر العسقلانیؒ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، امام شوکانیؒ اور امام صنعانیؒ وغیرہم لیکن ان بزرگوں کی کوششوں سے اختلاف دور نہیں ہوا —— نہ بعد میں ہونے والی کوششوں سے دور ہوگا۔

اس لئے کہ اختلاف کا سبب انسان کی فطرت میں، زندگی، لغت اور احکام کے مزاج میں موجود ہے اور جو شخص اسے بالکل ختم کرنا چاہتا ہے وہ لوگوں کو زندگی کو، لغت اور شریعت کو اس چیز کا مکلف بنانا چاہتا ہے جو ان کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہے مزید برآں علمی اختلاف میں فی نفسہ کوئی خطرہ بھی نہیں، جبکہ اس اختلاف کے ساتھ رواداری اور وسعت نظری بھی ہو اور تعصب، تہمت تراشی اور تنگ نظری سے پاک ہو۔

بہت سے فروعی مسائل اور عملی احکام میں صحابہ کرام رضؓ کے اندر اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے تھے اور کسی نے کسی پر کوئی عیب نہیں لگایا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین کا دور آیا۔ ان بزرگوں کو بھی اس اختلاف میں امت کیلئے وسعت اور رحمت اور فقہ اسلامی کے لئے شادابی اور ثروت نظر آئی۔ اس سے ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہیں پیدا ہوئی جیسا کہ کچھ بعد کے لوگوں میں پیدا ہوئی۔ پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں:

میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ فروعی مسائل میں صحابہ کرامؓ اختلاف نہ کرتے ۔۔۔ ان کا اختلاف تو رحمت ہے۔ صحابہ کرامؓ اور بعد کے لوگوں میں فروعی مسائل کے سلسلہ میں اختلاف کیوں کر نہ ہوتا، جب کہ خود رسول اللہ صلعم کی زندگی میں صحابہؓ کے اندر یہ اختلاف پیدا ہوا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے برقرار رکھا اور اختلاف کرنے والے کسی فریق کی ملامت نہیں کی۔ جیسا کہ نماز عصر کے سلسلہ میں پیش آیا غزوہ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ میں پہنچ کر

صحابہ کا گروہ آپؐ کا ارشاد سن کر روانہ ہو گیا لیکن ابھی راستے ہی میں تھے کہ کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ عصر کا وقت ختم ہونے کے قریب ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے نماز پڑھ لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول کی یہ تشریح کی کہ آپؐ کا مقصد یہ تھا ہم تیز چل کر جلد از جلد بنو قریظہ پہنچ جائیں نہ کہ نماز قضا کر دیں۔ لیکن دوسرے گروہ نے آپؐ کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا اور بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھی۔ پہلے گروہ نے مراد اور مقصد کو سمجھا اور دوسرے گروہ نے ظاہری الفاظ پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ یہ دونوں گروہ جیسا کہ امام ابن القیمؒ نے کہا ہے، ایک اہل الرای والقیاس کا پیش رو ہے تو دوسرا اہل الظاہر کا، اس اختلاف کے سلسلہ میں اہم ترین بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو دونوں گروہوں کی بات معلوم ہوئی تو آپ نے کسی کو ملامت نہیں کی ۔ نہ اس گروہ کو نہ اس گروہ کو، حالانکہ دونوں گروہوں میں سے ایک یقیناً غلطی پر تھا اور یہیں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کسی عمل کی بنیاد اجتہاد پر ہو تو نہ اس کی تکفیر کی جائیگی اور نہ وہ گنہگار ہوگا۔

ہم اپنے اس زمانہ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تمام لوگوں کو اپنے بنائے ہوئے ایک قالب میں ڈھال سکتے ہیں، ان کو ایک رائے پر جمع کر سکتے ہیں۔ نصوص شرعیہ کی فہم کے سلسلہ میں لوگ ان کے پیچھے چل سکتے ہیں ان کی قیادت تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس طرح مختلف فقہی مذاہب ختم ہو سکتے ہیں اختلافات مٹ سکتے ہیں اور تمام لوگ کلمہ سواء پر متحد ہو سکتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں نے یہ بات فراموش کر دی کہ نصوص کے سلسلہ میں ان کے فہم کی حیثیت بھی ایک رائے سے زیادہ نہیں، جس میں غلطی اور صحت دونوں کا احتمال ہے، اس لئے کہ کسی عالم کو عصمت کی ضمانت حاصل نہیں ہے چاہے اس میں اجتہاد کی تمام شرطیں پائی جاتی ہوں۔ جو کچھ ضمانت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اجتہاد پر خطا وصواب دونوں حالتوں میں اجر ملے گا۔ لہٰذا ان لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں مذاہب مدونہ کے ساتھ ساتھ ایک جدید مذہب (فقہی مسلک) کے اضافہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا۔ پھر تعجب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ناپسند کرتے ہیں کہ فقہی مذاہب کے پیرو اپنے اپنے امام کی پیروی اور تقلید کریں۔ دوسری طرف تمام لوگوں سے یہ خود اپنی تقلید اور پیروی کرانا چاہتے ہیں۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں ان کی اتباع نصوص کی دعوت یا فہم نصوص کے سلسلہ میں ان کے اجتہاد کی مخالفت کر رہا ہوں۔ یہ تو ہر اس مسلمان کا حق ہے جس میں اجتہاد کی شرطیں اور اسباب پائے جائیں۔ نیز یہ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ اس دروازہ کو بند

کردے جسے رسول اللہ صلعم نے امّت کے لئے کھولا ہے۔ میں جس چیز پر ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقہائے اسلام اور ان کے طریق کار پر زیادتی کرتے ہیں فقہ اسلامی کے عظیم موروثی سرمایہ کو حقیر سمجھتے ہیں اور لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں کہ تنہا وہی حق پر ہیں، ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ غلطی پر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس وہم میں بھی مبتلا ہیں کہ وہ سارے فقہی اختلافات کو ختم کر سکتے ہیں اور تمام لوگوں کو ایک رائے یا قول پر جمع کر سکتے ہیں۔

اسی مدرسہ فکر کے ایک صاحب علم نے ایک بار مجھ سے کہا۔ تمام کے تمام لوگ اس رائے پر کیوں نہیں جمع ہو جاتے جس کے ساتھ نص ہو؟

میں نے کہا، اس کے لئے ضروری ہے کہ نص تمام لوگوں کے نزدیک صحیح ہو اور مفہوم بھی صریح ہو۔ نیز اس کی مخالفت میں کوئی ویسی ہی یا اس سے قوی نص نہ ہو اور نہ وہ کسی قاعدہ کلیہ کے مخالف ہو۔ کبھی کبھی ایک نص ایک امام کے نزدیک صحیح ہوتی ہے لیکن دوسرے کے نزدیک وہ ضعیف ہوتی ہے اور کبھی وہ دوسرے امام کے نزدیک بھی صحیح ہوتی ہے لیکن اس کے مفہوم میں اختلاف ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی نص ایک امام کے نزدیک عام ہوتی ہے تو دوسرے کے نزدیک خاص، ایک کے نزدیک مطلق ہوتی ہے تو دوسرے کی نظر میں مقید۔ ایک امام ایک نص کو وجوب اور حرمت کے لئے دلیل سمجھتا ہے تو دوسرے کی نگاہ میں وہ استحباب اور کراہیت پر دلالت کرتی ہے۔ کسی کی نظر میں وہ محکم ہوتی ہے تو دوسرے کی رائے میں وہ منسوخ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ہی نص کی مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف حیثیت ہوتی ہے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" میں اور حکیم اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور رسالہ "الانصاف فی اسباب الاختلاف" میں ذکر کیا ہے اور علامہ الشیخ علی الخفیف نے کتاب "اسباب اختلاف الفقہاء" میں تفصیل سے لکھا ہے:

مثال کے طور پر یہ چند حدیثیں پیش ہیں :

۱. عن اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : ایما امرأۃ تقلدت قلادۃ من ذہب قلدت فی عنقہا مثلہا من النار یوم القیامۃ ، وایما امرأۃ جعلت فی اذنہا خوصا من ذہب ، جعل فی اذنہا مثلہ یوم القیامۃ .
"ابوداؤد ، النسائی"

○ حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت سونے کا ہار پہنے گی تو قیامت کے دن ویسا ہی آگ کا ہار اسے پہنایا جائے گا اور جو عورت اپنے کان میں سونے کی بالی ڈالے گی قیامت کے دن ویسی ہی آگ کی بالی اس کے کان میں پہنائی جائے گی ۔ (ابوداؤد، نسائی)

۲. عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلعم قال : من احب ان یحلق حبیبہ حلقۃ من نار فلیحلقہ حلقۃ من ذہب ، ومن احب ان یطوق حبیبہ طوقا من نار فلیطوقہ طوقا من ذہب و من احب ان یسور حبیبہ سوارا من نار، فلیسورہ بسوار من ذہب ولکن علیکم بالفضۃ فالعبوا بہا ."ابوداؤد"

○ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنے محبوب کو (قیامت کے دن) آگ کی بالی پہنانا چاہے تو وہ اسے سونے کی بالی پہنائے اور جو اپنے محبوب کو آگ کا طوق پہنانا چاہے تو وہ اسے سونے کا طوق پہنائے اور جو اسے آگ کا کنگن پہنانا چاہتا ہے تو وہ اسے سونے کا کنگن پہنائے ۔ لیکن ہاں تم چاندی سے کھیل سکتے ہو۔ (ابوداؤد)

۳. عن ثوبان رضی اللہ عنہ ان النبی صلعم انکر علی فاطمۃ رضی اللہ عنہا سلسلۃ من ذہب کانت تتحلی بہا فباعتہا واشترت بثمنہا عبدا فاعتقتہ فحدث بذلک النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال : الحمد للہ الذی انجی فاطمۃ من النار .
"النسائی"

○ حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ سونے کی ایک زنجیر زیور کے طور پر استعمال کرتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو حضرت فاطمہؓ نے اسے بیچ دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ پھر جب یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائی گئی تو آپؐ نے فرمایا : حمد اللہ ہی کے لئے ہے جس نے فاطمہؓ کو جہنم سے بچا لیا۔
(نسائی)

ان حدیثوں کے سلسلہ میں علمار کی رائیں الگ الگ ہیں۔

(۱) کچھ علمار نے ان حدیثوں کی سند پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس میں ضعف کے اسباب موجود ہیں اور یہ حدیثیں ضعیف ہیں۔ ان کی بنیاد پر کسی ایسی چیز کے حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا جس کی حلت عام لوگوں میں مشہور ہے اور اسی پر عمل بھی ہو رہا ہے اور تقریباً اس کا تعلق ہر مسلم گھر سے ہے، تحریم کا مسئلہ یقینی دلائل چاہتا ہے

(۲) کچھ دوسرے علمار ان حدیثوں کو صحیح مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ان کو منسوخ مانتے ہیں، اس لئے کہ عورتوں کے لئے سونے کے زیوروں کا استعمال دوسری دلیلوں سے ثابت ہے۔ بیہقی وغیرہ نے اس پر علمار کا اجماع نقل کیا ہے اور اسی پر فتویٰ اور عمل ہے۔

(۳) تیسرا گروہ ان علمار کا ہے جن کی رائے میں ان حدیثوں کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہے جو زیوروں کی زکوٰۃ نہیں ادا کرتے۔ اپنی رائے کی تائید میں ان لوگوں نے ایسی حدیثوں سے استدلال کیا جو نقد و جرح سے خالی نہیں ہیں، پھر زیور کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں مختلف فقہی مذاہب میں جو اختلاف ہے وہ بھی لوگوں کو معلوم ہے۔

(۴) چوتھا گروہ ان علمار کا ہے جو کہتے ہیں یہ وعید ان عورتوں کے لئے ہے جو بن سنور کر اپنے زیوروں کی نمائش کر کے اپنے تکبّر کا اظہار کرتی ہیں۔ ورنہ صرف زیور کے استعمال پر یہ وعید نہیں ہے۔ امام نسائیؒ نے کچھ ایسی حدیثوں کا ذکر ایک خاص عنوان "باب الکراہیۃ للنسار فی اظہار حلی الذہب" کے تحت کیا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں بعض علمار کی

رائے یہ ہے کہ یہ ناپسندیدگی سونے کے بھاری زیوروں کے لئے تھی اس لئے کہ اس میں فخر اور تکبر کا احتمال ہے۔

اس زمانے میں شیخ ناصرالدین البانی نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں ایک نیا مسلک اپنایا ہے۔ ان کی رائے میں یہ حدیثیں صحیح ہیں اور سونے کے زیوروں کی حرمت کے سلسلہ میں نص محکم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ کی یہ رائے اس اجماع اور عام فقہی مذاہب کی اس رائے اور فتویٰ کے خلاف ہے جس میں سونے کے زیوروں کو جائز اور مباح قرار دیا گیا اور اسی اجماع اور فتویٰ پر ڈیڑھ ہزار سال سے امت کا عمل ہے۔

تو کیا ایسی حالت میں کسی سلفی یا جدید عصری مدرسہ فکر کے بس کی یہ بات ہے کہ اختلافات کو ختم کر کے سب کو ایک رائے پر جمع کر دے جبکہ ہر گروہ کے پاس کوئی نہ کوئی حدیث یا اثر ہے اور وہ اس سے اپنی رائے کو مدلل کرتا ہے۔

جواب واضح ہے، ایسے مسائل میں لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے اور اس میں کوئی حرج اور نقصان بھی نہیں ہے۔

ولکل وجھۃ ھو مولیھا ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔

اس دور میں میں نے کسی مصلح اور مبلغ کو ایسا نہیں پایا جس نے اس مسئلہ کو اور اس کے آداب کو اس طرح سمجھا ہو جس طرح امام حسن البنا نے سمجھا اور اسی کے مطابق اپنے مکتبۂ فکر سے وابستہ افراد کی تربیت کی۔

امام موصوف کی یہ بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو، مسلمانوں کی انجمنوں اور تنظیموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے مخلصانہ اور شعوری کوششیں کیں تاکہ کم سے کم بنیادی اور اصولی باتوں میں مسلمان اکٹھے ہو سکیں۔

اس کے لئے آپ نے کچھ اصول اور ضابطے بھی بنائے جو "بیس بنیادی باتیں" کے نام سے مشہور ہیں لیکن اس سب کے باوجود آپ کی یہ رائے تھی کہ فروعی مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے اور اس سے بچنا ممکن نہیں۔ ایک سے زائد بار اپنے دعوتی رسالوں میں اس بات کو آپ نے بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

آپ کی ایک کتاب ہے، اس کا نام ہے 'ہمارا پیام' (دعوتنا) اس میں اپنی دعوت کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے یہ ایک آفاقی پیام ہے اس کا تعلق کسی خاص گروہ سے نہیں ہے اور نہ اس میں کسی ایک رائے کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے، اس کا رُخ خالص دین اور اس کی روح کی طرف ہے یہ لوگوں کے نقطۂ نظر اور عزائم کو متحد کرنا چاہتی ہے تاکہ عمل زیادہ نفع بخش بن جائے اور بڑے اور عظیم نتائج حاصل ہوں۔ یہ دعوت حق کے ساتھ ہے، چاہے حق جہاں ہو، یہ اتحاد و اتفاق کو پسند کرتی ہے اور اختلاف کو ناپسند، اختلاف اور تفرقہ ہی مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت ہے، ماضی میں مسلمانوں نے جو کامیابیاں حاصل کیں اس کی بنیاد، محبت اور اتحاد و اتفاق تھا۔ اوّلیں دور میں امت کی اصلاح جس چیز سے ہوئی ہے۔ بعد والوں کی اصلاح کے لئے بھی وہی چیز ضروری ہے لیکن اتحاد و اتفاق کی اس اہمیت اور تفرقہ اور اختلاف سے اس ناپسندیدگی کے اظہار کے باوجود شیخ حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمارا یہ یقین ہے کہ فروعی مسائل میں اختلاف ایک ناگزیر حقیقت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ان اختلافی مسائل میں تمام فقہاء اور فقہی مذاہب متحد ہو جائیں، اس کے لئے کچھ اسباب ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

۱۔ **ذھنی اور عقلی تفاوت!** مسائل کے استنباط میں، دلائل کے

ادراک اور فہم میں، مفہوم کی گہرائی تک پہنچنے میں، حقائق کو باہم مربوط کرنے میں اس تفاوت کا اثر پڑتا ہے، دین میں ان مسائل کا تعلق آیات واحادیث اور نصوص سے ہے اور اس کی شرح عقل ورائے سے زبان اور اس کی گرامر کے دائرے میں رہتے ہوئے کی جاتی ہے اور لوگوں کے اندر اس سلسلہ میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ پھر اختلاف سے چارہ کیا؟

۲۔ معلومات کی کمی بیشی! مثلاً یہ کہا جائے کہ انھیں یہ بات یا حدیث معلوم ہے لیکن دوسروں تک یہ بات نہیں پہنچی ہے، اسی لئے امام مالکؒ نے ابوجعفر سے کہا تھا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ مختلف شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ان میں سے ہر گروہ کے پاس علم ہے ایسی حالت میں اگر تم ان سب لوگوں کو ایک رائے پر جمع ہونے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کروگے تو اس سے فتنہ برپا ہوگا۔

۳۔ ماحول کا اختلاف! احکام کے نفاذ میں ماحول کے اختلاف کا اثر پڑتا ہے آپ جانتے ہیں کہ جب تک امام شافعی عراق میں رہے بہت سے فروعی مسائل میں ان کی ایک رائے رہی، ان کی اسی رائے کو قول قدیم کہا جاتا ہے لیکن جب مصر گئے تو ان کی رائے بدل گئی اور اس بدلی ہوئی رائے کو قول جدید کہا گیا اور ان دونوں فتووں میں امام شافعیؒ نے اپنی اسی رائے کا اظہار کیا جو انھیں صحیح اور حق کے مطابق معلوم ہوئی، حق سے تجاوز کہیں نہیں کیا۔

۴۔ قلبی اطمینان! جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں راوی اس امام کے نزدیک ثقہ ہے تو دل اس پر مطمئن ہوجاتا ہے اور مسئلہ کا اس سے لینا اچھا معلوم ہوتا ہے ——— لیکن وہی راوی دوسرے امام کے نزدیک مجروح ہوتا ہے

اس لئے کہ دوسرے امام کو اس راوی کی وہ باتیں معلوم ہیں جو اس کی ثقاہت کو مجروح کر دیتی ہیں۔

۵۔ دلائل کی اہمیت میں اختلاف! ایک کی نگاہ میں لوگوں کے عمل کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ اسے خبر احاد پر مقدم رکھتا ہے۔ لیکن دوسرے کی رائے اس سے مختلف ہوتی ہے اور لوگوں کے عمل کو وہ خبر احاد پر مقدم نہیں رکھتا۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ دین کے فروعی مسائل میں ایک رائے پر اتفاق کر لینا امر محال نہیں ہے بلکہ دین کے مزاج کے بھی خلاف ہے اللہ چاہتا ہے کہ یہ دین ہمیشہ باقی رہے زمانے کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہے اسی لئے یہ سہل ہے، آسان ہے، اس میں نرمی ہے، جمود اور شدّت پسندی نہیں۔

جو لوگ فروعی مسائل میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں ہم اپنے اسی یقین کے باعث ان کے عذر کو تلاش کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ اختلاف قلبی تعلقات، باہمی محبت اور تعاون علی الخیر کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا، اسلام کے وسیع اور افضل مفہوم نے ہم سب کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے، ہم جیسے مسلمان ہیں وہ بھی ویسے ہی مسلمان ہیں۔ ان مسائل میں ہم جس طرح قلبی اطمینان کو پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اسے پسند کرتے ہیں، کیا یہ ہم سے مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جو چیز ہم اپنے لئے پسند کریں وہی اپنے بھائیوں کے لئے بھی پسند کریں؟ پھر باہمی مخالفت کیوں؟ ہم ان کی رائیوں پر اور وہ ہماری رائیوں پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے، اگر ضرورت ہو تو خلوص اور محبّت کی فضا میں ہم آپس میں مفاہمت کیوں نہیں کرتے؟

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ رضؓ ہیں یہ بعض مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے تو کیا اس اختلاف نے ان کے دلوں میں بھی اختلاف پیدا کر دیا تھا

ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا؟ ان کے باہمی تعلقات کو ختم کر دیا تھا؟ یہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا، بنی قریظہ میں نماز عصر پڑھنے والی بات کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہو چکا ہے۔

فروعی مسائل میں اگر صحابہؓ کے اندر اختلاف ہو سکتا ہے جب کہ زمانہ کے لحاظ سے وہ عہد نبوت سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ احکام کے قرائن سے سب سے زیادہ آگاہ ہیں۔ پھر ہمارے لئے کیا جواز ہے کہ ہم معمولی اختلافات کے باعث آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں؟ یہ ائمہ کرامؒ ہیں، اللہ کی کتاب اور سنّت رسول کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، بعض مسائل میں ان میں سے کسی کو کسی سے اختلاف رہا ہے، کسی نے کسی سے مناظرہ بھی کیا لیکن یہ اختلاف ان کے قلبی تعلقات اور باہمی روابط پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ پھر یہی رویہ ہمارے لئے کیوں صحیح نہیں رہا؟ اختلاف تو فروعی مسائل میں سب سے مشہور مسئلہ اذان میں بھی ہوا ہے جو روزانہ پانچ بار دی جاتی ہے اور جس کے سلسلہ میں نصوص اور آثار موجود ہیں، پھر ان فروعی مسائل کا کیا سوال جن کی بنیاد صرف رائے اور استنباط پر ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی ہے جس پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، پہلے اگر لوگوں میں اختلاف ہوتا تھا تو وہ فیصلہ کے لئے خلیفۃ المسلمین کی طرف رجوع کرتے تھے۔ خلیفہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیتا اور اس کا فیصلہ اختلافات کو ختم کر دیتا، لیکن آج خلیفہ کہاں؟ پھر ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ وہ قاضی کو تلاش کریں اور اپنے مسائل کو اس کے سامنے پیش کریں، اس لئے کہ باہمی اختلافات کو طے کرنے کے لئے جب تک کوئی مرجع نہ ہو گا تب تک اختلافات ختم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی جائیں گے۔

ہمارے بھائی ان تمام باتوں سے آگاہ ہیں اسی لئے مخالفین کے تئیں

ان کے دل کشادہ ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہر گروہ کے پاس علم ہے اور ہر پیام میں حق و باطل ہے وہ حق کو پسند کرتے ہیں اور اسے لے لیتے ہیں — اور مخالفین کو آسانی اور نرمی سے اپنے نقطہ نظر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر مطمئن ہوجاتے ہیں تو یہی مراد ہے اور اگر مطمئن نہیں ہوتے ہیں تو پھر بھی وہ ہمارے دینی بھائی ہیں، ہم اپنے لئے اور ان کے لئے اللہ سے ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔

اختلافی مسائل کے سلسلہ میں الشیخ حسن البنا کی یہی رائے اور موقف ہے جس سے دین، تاریخ اور عملی زندگی کے بارے میں ان کی گہری سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔

ان اختلافی مسائل کے سلسلہ میں حسن البنا کے عملی موقف کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ویسی ہی باتیں دوسرے علمائے حق کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ اور اس سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے حسن البنا رح کے حالات میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار وہ کسی بستی میں تقریر کرنے کے لئے گئے، رمضان کا مہینہ تھا بستی کے لوگ تراویح کے مسئلہ میں دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ تراویح کی نماز بیس رکعت ہے جیسا کہ حضرت عمر رض کے زمانہ میں پڑھی گئی اور اس کے بعد صدیوں سے لوگ اسی پر عمل کر رہے ہیں یا صرف آٹھ رکعت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان یا غیر رمضان میں آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی، پوری بستی انھیں دونوں رایوں میں منقسم ہو کر رہ گئی، ہر گروہ اپنے آپ کو حق اور سنت پر سمجھتا تھا اور دوسرے گروہ کو غلطی اور بدعت پر، دھیرے دھیرے جنگ و جدال کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی کہ ان لوگوں نے سنا کہ مرشد حسن البنا آرہے ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی دونوں گروہ اس بات پر راضی ہو گئے مرشد کو پنچ مان لیا جائے ساتھ ہی ساتھ ان میں سے ہر گروہ یہ گمان کر رہا تھا کہ مرشد اسی کے حق میں فیصلہ دیں گے
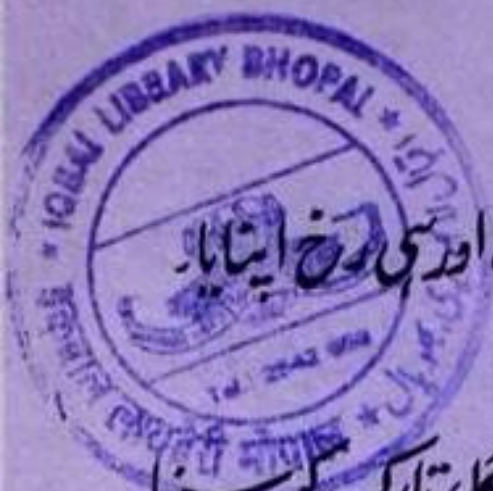
لیکن مرشد حسن البنا رحؒ نے اس اختلاف کو حل کرنے کے لئے ایک اور ہی رخ اپنایا۔

مرشد نے لوگوں سے کہا: نمازِ تراویح کا کیا حکم ہے؟

لوگوں نے کہا: یہ سنّت ہے پڑھنے والے کو ثواب ملے گا، تارک کو سزا نہیں دی جائے گی۔

مرشد نے کہا: مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت کا کیا حکم ہے؟

لوگوں نے کہا: یہ ایک دینی فریضہ ہے اور اسلام کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے۔

مرشد حسن البنا نے کہا: کیا اللہ کی شریعت میں یہ جائز ہے کہ ایک سنّت کی حفاظت میں ہم ایک فریضہ کو ضائع کر دیں؟ اگر آپ لوگ اپنی اسلامی اخوت اور اتحاد کو باقی رکھیں اور اپنے اپنے گھروں میں جائیں اور جس کے نزدیک جس رائے کے حق میں دلیل قوی معلوم ہو اور اس کا دل بھی اس پر مطمئن ہو تو اسی کے مطابق وہ آٹھ یا بیس رکعت تراویح پڑھے تو یہ جنگ وجدال اور لڑائی جھگڑے سے زیادہ بہتر ہے۔

میں نے مرشد حسن البنا رحؒ کے اس واقعہ کا ذکر ایک آدمی سے کیا تو اس نے کہا۔ یہ تو حق سے فرار ہے سنّت کو بدعت سے واضح کرنا واجب ہے۔

میں نے کہا: اس معاملے میں گنجائش ہے میں اگرچہ آٹھ رکعت تراویح پڑھتا ہوں، لیکن بیس رکعت پڑھنے والوں کو بدعتی نہیں کہتا۔

اس نے کہا: اختلافات میں فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ اس سے فرار صحیح نہیں!

میں نے کہا: ہاں یہ بات صحیح ہے جب کہ معاملہ حرام اور حلال یا حق و باطل کا ہو۔ رہے وہ فروعی مسائل جن میں فقہی مذاہب کا اختلاف ہے۔ تو ان کے سلسلہ میں ہر فقہی مسلک کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اور ان کا تعلق جواز اور افضلیت سے ہوتا ہے

حرام، حلال یا حق و باطل سے نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں شدت اور سختی کی ضرورت نہیں انصاف پسند علمار کی یہی رائے ہے اور اسے انھوں نے پوری وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔

"شرح غایۃ المنتھی" حنبلی مذہب کی مشہور کتاب ہے ـــ اس میں لکھا ہے:

جو شخص اجتہاد کے مسائل میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے نہ مجتہدین کے مقام سے آگاہ ہے اور نہ یہ بات جانتا ہے کہ حق کی تلاش میں ان لوگوں نے کتنی راتیں جاگ کر گذاری ہیں، کتنی کوشش صرف کی ہے اور اپنا کتنا قیمتی وقت لگایا ہے۔ خطار وصواب ہر حال میں انھیں اجر ملے گا اور ان کے پیرو نجات پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے اجتہاد کو ان کے لئے شرع بنادیا ہے، جیسے مردار مضطر کے لئے حلال ہے لیکن غیر مضطر کے لئے حرام ہے یہ دونوں حکم دونوں فریقوں، مضطر اور غیر مضطر کے لئے ثابت ہیں، ایسی حالت میں اس مسئلہ میں مجتہد کا جو ظن غالب ہوگا وہی اس کے اور اس کے مقلدین کے لئے اللہ کا حکم ہوگا۔

فتاوی مصریہ میں ابن تیمیہؒ سے منقول ہے۔

اتحاد واتفاق کی رعایت رکھنا حق ہے، جہاں مصلحت غالب ہو وہاں بسم اللہ جہراً پڑھی جاسکتی ہے اسی طرح تالیف قلوب کے لئے افضل کا چھوڑنا بھی مناسب ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کی تعمیر چھوڑ دی تھی، بسم اللہ اور وتر کے ملانے کے سلسلہ میں یہی بات امام احمدؒ نے بھی کہی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد واتفاق کو برقرار رکھنے یا سنت سے آگاہ کرنے کے لئے افضل کو چھوڑ کر جائز پر عمل کرنا صحیح ہے واللہ اعلم۔

اوپر جو بات کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیت اللہ کی تعمیر ترک کردی تھی اس سے اشارہ اس حدیث کی طرف ہے۔ جس میں آپؐ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا:

لولا قومك حديثو عهد بجاهلية لبنيت الكعبة على قواعد ابراهيم

"اگر تمہاری قوم ابھی جلدی ہی جاہلی دور سے نکل کر اسلام میں نہ آئی ہوتی تو میں ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر از سر نو کعبہ کی تعمیر کرتا۔" (بخاری)

اور یہ علامہ ابن القیم ہیں، صبح کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں کہتے ہیں: کچھ لوگوں کی رائے میں اس کا پڑھنا کسی حال میں صحیح نہیں نہ مصیبت، اور پریشانی کے دنوں میں نہ عام دنوں میں۔ ان کے خیال میں صبح کی نماز میں دعائے قنوت کا پڑھنا بدعت ہے، جب کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک صبح کی نماز میں قنوت کا پڑھنا مستحب ہے ـــــ مصیبت اور پریشانی کے دنوں میں بھی اور عام دنوں میں بھی۔ پھر ان دونوں رایوں میں ترجیح دیتے ہوئے امام ابن القیم نے لکھا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ آپؐ مصائب اور شدائد کے موقع پر دعائے قنوت پڑھتے تھے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے اور فقہائے حدیث کا اسی پر عمل ہے، چنانچہ جن مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قنوت پڑھی ہے وہ بھی پڑھتے ہیں اور جہاں نہیں پڑھی ہے وہاں وہ بھی نہیں پڑھتے چنانچہ دونوں حالتوں میں رسول اللہ صلعم کی پیروی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؐ کا فعل بھی سنت ہے اور ترک بھی سنت ہے لیکن اس کے باوجود جو شخص ہمیشہ پڑھتا ہے اس پر نکیر نہیں کرتے نہ اس کے پڑھنے کو مکروہ کہتے ہیں نہ بدعت قرار دیتے ہیں اور نہ

نا پڑھنے والے کو سنّت کا مخالف کہتے ہیں اور یہی رویہ ان کا ان لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو شدائد اور مصائب کے موقع پر بھی اس کا پڑھنا صحیح نہیں سمجھتے . . . مختصر یہ کہ جس نے پڑھا اس نے بھی اچھا کیا اور جس نے نہیں پڑھا اس نے بھی اچھا کیا۔

نیز فرمایا : رکوع کے بعد قیام۔ دعاء اور حمد و ثنا کا محل ہے، آنحضرتؐ نے قیام میں دونوں کو جمع کر دیا ہے، دعائے قنوت بھی دعاء اور ثناء، دونوں کی جامع ہے، اسی لئے رکوع کے بعد قیام کی حالت میں اس کا پڑھنا اولیٰ ہے۔ اور اگر کبھی کبھی امام اسے زور سے پڑھ دے تاکہ مقتدی بھی جان لیں تو کوئی حرج نہیں۔

حضرت عمرؓ نے مقتدیوں کو سکھانے کے لئے نماز میں ثناء کو زور سے پڑھا، حضرت ابن عباسؓ نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ زور سے پڑھی تاکہ مقتدی جان لیں کہ یہ بھی سنّت ہے اور یہی بات امام کے بارے میں زور سے آمین کہنے کے سلسلہ میں کہی جا سکتی ہے۔

یہ ان اختلافات میں سے ہے جو مباح ہیں، اس کے بارے میں نہ اس پر عمل کرنے والوں پر سختی کی جائے گی اور نہ عمل نہ کرنے والوں پر، یہ ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا نماز میں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کا ہے یا جیسا اختلاف تشہدٗ اذانٗ اقامت اور حج کی مختلف قسموں، افراد، قران اور تمتع کے باب میں پایا جاتا ہے۔

ان چیزوں کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا طریقہ آجائے کہ وہی قبلہ مقصود ہے اور اس کتاب میں اسی پر توجہ مرکوز رہی ہے اور اسی پر تحقیق و طلب کا مدار ہے اور یہ ایک اہم چیز ہے۔ اب رہے وہ مباح اختلافات جن پر عمل کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں اور کسی پر نکیر نہیں کی جائے گی، تو یہ ایک اور ہی چیز ہے۔ ہم نے اس کتاب میں "کیوں ؟" سے بھی تعرض نہیں کیا ہے اور نہ

یہ بحث کی ہے کہ یہ کیوں جائز ہے اور یہ کیوں جائز نہیں ہے؟ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہم اس طریقہ کو پیش کر دیں جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے پسند فرمایا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی سب سے کامل اور افضل طریقہ ہے اسی لئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں دعائے قنوت اور تعوذ کے بعد بسم اللہ زور سے پڑھنے پر ہمیشگی نہیں برتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس پر مداومت مکروہ یا بدعت ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی اکمل اور افضل ہے۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ مقتدی اگر یہ دیکھے کہ وہ جس امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے وہ اپنے مسلک کے مطابق کچھ ایسی چیزیں کر رہا ہے جو مقتدی کے مسلک کے مطابق وضو کو توڑ دیتی ہیں یا نماز کو باطل کر دیتی ہیں تب بھی اسے اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیئے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ارشاد ہے:

"مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کی نمازیں ایک دوسرے کے پیچھے ہو جاتی ہیں جیسا کہ صحابہؓ تابعین اور ان بزرگوں کے بعد چاروں اماموں کے زمانہ تک لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ بدعتی، گمراہ اور کتاب و سنت اور اجماع کا مخالف ہے۔"

صحابہؓ اور تابعین میں وہ لوگ بھی تھے جو بسم اللہ کو جہراً پڑھتے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو بسم اللہ کو جہراً نہیں پڑھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی وغیرہ

مدینہ کے مالکی اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے جب کہ یہ مالکی امام سرے سے بسم اللہ ہی نہیں پڑھتے تھے نہ سرًا نہ جہرًا۔

امام ابو یوسفؒ نے عباسی خلیفہ رشید کے پیچھے نماز پڑھی، خلیفہ نے امام مالکؒ کے فتوی کے مطابق سینگی لگوانے کے بعد وضو نہیں کیا تھا۔ پھر بھی امام ابو یوسفؒ نے خلیفہ کے پیچھے نماز پڑھی اور اسے دہرایا نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے کہ پچھنا لگوانے اور نکسیر پھوٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر میرا امام ایسا ہو کہ اس کے جسم سے خون نکلے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ لوں؟۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کہا: کیوں کر ممکن ہے کہ تم سعید بن المسیبؒ اور امام مالکؒ کے پیچھے نماز نہ پڑھو! نیز فرمایا: اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ مقتدی نہیں جانتا ہے کہ امام نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو اس کی نماز کو باطل کر دیتا ہے، ایسی حالت میں سلف اور چاروں اماموں اور دیگر اکابر علماء کا اتفاق ہے کہ وہ اس امام کے پیچھے نماز پڑھے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقتدی جانتا ہے کہ امام نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو اس (مقتدی) کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ مثلاً شرمگاہ کو چھو لیا یا خواہش نفس کے ساتھ عورت کو چھو لیا یا سینگی لگوائی یا فصد کھلوائی یا قے کر لی اور پھر وضو کئے بغیر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا تو ایسی صورت میں اختلاف ہے، لیکن جمہور سلف کی یہی رائے ہے کہ مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔ امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے، امام شافعیؒ کے قول ثانی سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، حنفی مسلک میں بھی ایک رائے اسی کے حق میں ہے ــــــ حنبلی مسلک کی بیشتر نصوص سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور یہی صحیح بھی ہے کہ

مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔

(الفوائد العدیدة : ۲/۱۸۱) (فتاوی معاصرہ۔ دوسرا ایڈیشن ، صفحہ ۲۰۱-۲۰۴)

اعمال کی قدر و قیمت اور ان کے فرق مراتب سے آگاہی

علم دین اور فقہ دین کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اعمال کی قدر و قیمت اور شریعت میں ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہی حاصل ہو، اور مامورات (جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے) اور منہیات (جن چیزوں سے روکا گیا ہے) میں سے ہر ایک کو خلط ملط کئے بغیر۔ ان کے مرتبہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان کی جگہ پر رکھا جائے۔ نہ مماثل چیزوں میں تفریق کی جائے اور نہ مخالف اور متضاد چیزوں کو ایک سطح پر رکھا جائے۔

اسلام نے مامورات میں سے ہر چیز کی ایک قدر و قیمت متعین کی ہے اور زندگی اور نفس پر جو اس کا اثر پڑتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کا رخ مقرر کیا ہے۔ ان اثرات میں سے کچھ کو ہم جانتے ہیں اور کچھ کو نہیں جانتے۔

اسی طرح اسلام نے منہیات کی، ان سے پہنچنے والے مادی اور معنوی نقصان کے پیش نظر حد بندی کی ہے۔

مامورات کے مراتب

اسلام میں جو باتیں مطلوب ہیں، ان کے الگ الگ مراتب اور درجے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں :۔

مستحب : جس کے کرنے کی شریعت میں ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن چھوڑ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

سنّت مؤکدہ : جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیشہ عمل کیا ہو، شاذ و نادر ہی کبھی

چھوڑا ہو لیکن دوسروں سے اس پر عمل کا حتمی مطالبہ نہیں کیا۔ اسی لئے صحابہ رضہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو کبھی کبھی اس پر عمل چھوڑ دیتے تھے تاکہ لوگ اسے واجب سمجھ کر اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کریں۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکر رضہ اور حضرت عمر رضہ اسی کے پیش نظر کبھی کبھی قربانی چھوڑ دیتے تھے۔

واجب : جسے کرنے کا شارع نے حکم دیا ہے لیکن یہ حکم قطعیت کے درجہ کا نہیں ہوتا

فرض : جس کی فرضیت قطعی دلائل سے ثابت ہو اور اس میں کسی طرح کا شبہ نہ ہو، اس پر عمل کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ترک پر عذاب، اس کا چھوڑنا فسق ہے اور انکار کفر، اور یہ بات معلوم ہے کہ فرض کی دو قسمیں ہیں۔ فرض کفایہ اور فرض عین۔

فرض کفایہ : اگر کچھ لوگ اس پر عمل کرلیں تو باقی لوگوں سے عمل نہ کرنے کا گناہ ساقط ہوجاتا ہے۔

فرض عین : اس پر عمل کرنا سب کے لئے لازم ہے۔

فرض عین کے بھی درجے اور مراتب ہیں، کچھ ایسے فرائض ہیں جنھیں اسلام نے دین کا بنیادی رکن قرار دیا ہے اور یہ پانچ ہیں :

(۱) یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں۔

(۲) نماز قائم کرنا۔

(۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔

(۴) رمضان کے روزے رکھنا۔

(۵) صاحب استطاعت کا بیت اللہ کا حج کرنا۔

ان کے علاوہ دوسرے فرائض بھی ہیں جو اہمیت اور منزلت میں ان سے کم ہیں، اگرچہ دین میں ان پر عمل قطعی طور پر مطلوب ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام فرض عین کو فرض کفایہ پر مقدم رکھتا ہے۔ اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں رہتا ہے تب تک وہ والدین کی خدمت اور اطاعت کو جہاد پر مقدّم رکھتا ہے اور کسی بیٹے کو والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے یہی بات ثابت ہے۔

اسی طرح وہ اس فرض عین کو جس کا تعلق پورے سماج سے ہو، اس فرض پر مقدم رکھتا ہے جس کا تعلق ایک یا چند افراد سے ہو مثلاً جہاد اور والدین کے ساتھ نیک سلوک۔ پس جب جہاد کسی کافر دشمن کے حملہ کی حالت میں۔ کسی قوم پر فرض عین ہو جاتا ہے تو وہ والدین کی خدمت واطاعت پر مقدم ہو جاتا ہے۔

اسلام فرض کو واجب پر، واجب کو سنّت پر، سنّت مؤکدہ کو مستحب پر مقدّم رکھتا ہے۔

اسی طرح اسلام اجتماعی نیکی اور اطاعت کو انفرادی نیکی اور اطاعت پر مقدّم رکھتا ہے۔ اور اس کی نظر میں جس نیکی اور اطاعت کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے وہ اس نیکی اور اطاعت سے افضل ہے جس کا فائدہ فاعل کی ذات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، اسی لئے وہ جہاد کو انفرادی عبادت سے فقہ اور علم حاصل کرنے کو نفلی عبادت سے، عالم کو عابد سے صلح صفائی کرانے کے کام کو نفلی نماز، روزہ اور صدقہ سے افضل قرار دیتا ہے، اس کی نگاہ میں امام عادل کا رعیت کے کام میں مشغول رہنا۔ نفلی عبادتوں میں مشغول رہنے سے بدرجہا افضل ہے۔

لیوم من امام عادل افضل من عبادۃ ستین سنۃ — امام عادل کا ایک دن ستّر سال کی عبادت سے افضل ہے

اسی طرح اسلام قلبی اعمال کو جوارح کے اعمال پر ترجیح دیتا ہے، عقیدہ کو عمل پر مقدم رکھتا ہے اور اسے محور اور اساس قرار دیتا ہے۔

دورِ انحطاط میں مسلمانوں سے جو چوک ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) مسلمانوں نے بڑی حد تک اس فرض کفایہ کو نظر انداز کر دیا جس کا تعلق پوری امّت سے تھا۔ مثلاً سائنسی، صنعتی اور جنگی علوم وفنون میں تفوق حاصل کرنا — اسی طرح فقہ میں اجتہاد اور استنباط احکام۔ دعوت اسلامی کی نشر واشاعت اور سلطان جائر کے مقابلہ کے سلسلہ میں بھی غفلت برتی۔

(۲) بعض فرائض عینیہ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ یا اس کی قدر وقیمت کو گھٹا دیا مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو جو اہمیت ملنی چاہئے تھی وہ نہیں دی گئی۔

(۳) دین کے بعض ارکان کے مقابلہ میں بعض ارکان کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ مثلاً نماز سے زیادہ روزہ کا اہتمام کیا گیا، اسی لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان، مرد یا عورت رمضان میں روزہ نہ رکھے لیکن ایسے مسلمان پائے جاتے ہیں جو نماز میں سستی برتتے ہیں، خاص طور سے عورتیں۔ ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جن کی عمریں گذر جاتی ہیں لیکن ایک بار بھی نہ اللہ کے آگے جھکتے ہیں، نہ سجدہ ریز ہوتے ہیں، اسی طرح بعض لوگ زکوٰۃ سے زیادہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ۲۸ مقامات پر ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔

حضرت ابوبکر الصدیق کا ارشاد ہے:

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ

"خدا کی قسم میں اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا"۔

(۴) کچھ لوگوں نے نوافل کا فرائض اور واجبات سے زیادہ اہتمام کیا۔ مثلاً بہت سے متاخرین صوفیہ کے ہاں اذکار، اوراد اور تسابیح کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے لیکن یہ اہتمام بہت سے اجتماعی فرائض۔ مثلاً انکار منکر اور اجتماعی اور سیاسی ظلم کے مقابلہ کے سلسلہ میں نہیں پایا جاتا۔

(۵) انفرادی عبادات مثلاً نماز اور ذکر کا اہتمام ان اجتماعی عبادات سے زیادہ کیا گیا، جن کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے مثلاً جہاد، فقہ، اور دین کی سوجھ بوجھ حاصل کرنا لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانا نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرنا۔ اور ایک دوسرے کو نیکی اور شفقت کی نصیحت کرنا۔

(۶) اور آخری بات یہ ہے کہ لوگوں نے فروعی اعمال کا زیادہ اہتمام کیا اور اسلام کی بنیادی باتوں، عقیدہ، ایمان، توحید اور اخلاص سے غفلت اور بے توجہی برتی۔

منہیات کے مراتب

اسلام نے جن چیزوں سے روکا اور منع کیا ہے ان کے بھی درجے اور مراتب ہیں۔

مکروہ تنزیہی : جو حلال سے قریب تر ہو۔

مکروہ تحریمی : جو حرام سے قریب تر ہو۔

المشتبہات : اسے بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اور جو اس میں پڑتا ہے حرام میں پڑ جاتا ہے محفوظ چراگاہ کے اردگرد چرانے والے جانور کے بارے میں اندیشہ رہتا ہے کہ وہ محفوظ چراگاہ میں نہ چلا جائے۔

حرام صریح : جسے اللہ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ — جن چیزوں کو تم پر حرام قرار دیا ہے اللہ نے ان کی تفصیل تمھیں بتا دی ہے۔ (الانعام: ۱۱۹)

حرام کی دو قسمیں ہیں، صغائر اور کبائر، نماز، روزہ اور صدقہ چھوٹے موٹے گناہوں کو دور کر دیتے ہیں۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ — درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ (ہود: ۱۱۴)

صحیح حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر کبائر سے بچا جائے تو پانچوں نمازیں، جمعہ کی نماز اور رمضان کے روزے صغیرہ گناہوں کو دور کر دیتے ہیں، اب رہے کبیرہ گناہ تو وہ صرف اس سچی توبہ سے دور ہو سکتے ہیں جس میں دل کبیرہ کے ارتکاب پر نادم ہوتا ہے۔ اور گرم آنسو اسے پاک کر دیتے ہیں۔

کبائر کے بھی مختلف درجے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا شمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکبر الکبائر میں کیا ہے، ان میں سر فہرست شرک ہے یہ وہ گناہ ہے جو توبہ کے بغیر کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ — اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے (النساء: ۴۸)

اس کے بعد وہ دوسرے گناہ ہیں جن کا ذکر حدیثوں میں آیا ہے مثلاً والدین کی نافرمانی، جھوٹی گواہی، جادو، ٹونا، قتل ناحق، سود کھانا، یتیم کا مال ہضم کر لینا باعصمت مومن خواتین پر تہمت لگانا۔

اس ضمن میں دورِ انحطاط میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ان میں سے کچھ

درج ذیل ہیں :

(۱) بہت سے لوگ حرام کے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ مکروہات اور مشتبہات کے خلاف جنگ میں مشغول رہے، اسی طرح جو چیزیں قطعاً حرام ہیں ان سے تو غفلت برتی اور جن چیزوں کی حلت وحرمت میں اختلاف ہے اس میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے

(۲) بہت سے لوگ یکسو ہو کر صغائر کی مخالفت میں لگ گئے لیکن تباہ کن کبائر مثلاً نجوم، سحر، کہانت، قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، غیر اللہ کی نذر ونیاز، مردوں کے نام پر قربانی کرنا، اور استعانت بالموتی وغیرہ کو نظر انداز کر دیا جس نے عقیدہ توحید کی صفائی وستھرائی اور اس کی آب وتاب کو دھومل کر دیا۔

اعمال کے لحاظ سے لوگوں کے مرتبے

جس طرح اعمال، مامورات اور منہیات دونوں ہی کے درجے اور مرتبے ہیں، اسی طرح عملی لحاظ سے مسلمانوں کے بھی درجے اور مرتبے ہیں۔ اس لئے کچھ دین دار حضرات جب سب لوگوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر معاملہ کرتے ہیں اور عام وخاص میں مبتدی اور منتہی میں، قوی اور ضعیف میں کوئی فرق نہیں کرتے تو یہ بڑی غلطی ہوتی ہے کیوں کہ دین میں ان سب کے لئے، ان کی استعداد اور مرتبہ کے لحاظ سے گنجائش ہے، اسی لئے دین میں عزیمت ہے، رخصت ہے، عدل ہے فضل ہے، فرض ہے، نفل ہے سنّت ہے اسی ضمن میں ایک پرانی کہاوت بھی ہے۔

حسنات الابرار سیئات المقربین

"ابرار کی اچھائیاں مقربین کے لئے برائیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(فاطر: ۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اسکی وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا، اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی بیچ کی راس ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنیوالا ہے

ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو بعض دینی واجبات میں کوتاہی برتتا ہے نیز شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں سے بعض سے بچتا نہیں۔

اور مُّقْتَصِدٌ کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو فرائض کی پابندی کرتا ہے اور حرام چیزوں سے بچتا ہے۔

اور سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو صرف فرائض پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سنن اور مستحبات پر بھی عمل کرتا ہے، اسی طرح وہ صرف حرام چیزوں کو چھوڑنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بھی بچتا ہے بلکہ احتیاطاً بعض ایسی چیزوں سے بھی بچتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

اور یہ تینوں قسمیں اس ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کے ساتھ اس امت میں داخل ہیں جسے اللہ نے الکتاب (قرآن) کا وارث بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ

(فاطر: ۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس کی وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔

لہٰذا ایسی حالت میں یہ بات غلط ہوگی کہ کچھ لوگوں کو ملت سے محض اس لئے خارج کردیا جائے کہ ان لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور گنہگار رہیں۔ اسی طرح یہ

بھی غلطی ہو گی کہ اوپر جن تین قسموں کا بیان ہوا، اسے نظر انداز کر دیا جائے اور سب کے ساتھ معاملہ اس بنیاد پر کیا جائے کہ ہر ایک کے لئے سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ کے درجے میں ہونا ضروری ہے۔

کچھ مخلص دین دار حضرات اپنے دینی جوش اور شدّت احساس کے باعث بعض دوسرے مسلمانوں کو بے دین، یا خارجِ از دین قرار دینے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور ان کے تئیں سختی اور دشمنی کا رویہ اپنا لیتے ہیں اس لئے کہ وہ کسی گناہ صغیرہ یا کسی ایسی مشتبہ چیز کے مرتکب ہو گئے ہیں جس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، دلائل میں تعارض ہے اور جس کی قطعی حرمت کسی حال میں ثابت نہیں ہے۔

ان اچھے اور مخلص لوگوں نے یہ بات فراموش کر دی کہ کسی گناہ صغیرہ کے باعث دوسروں کی دین داری کو مجروح یا ساقط الاعتبار قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ قرآن پاک نے اللَّمَمَ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ نیکیوں کی نیکیوں کو ختم نہیں کرتا۔ اسی طرح قرآن پاک نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب صغیرہ گناہوں کو دور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۝ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ

اور زمین اور آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو بھی جزا سے نوازے جنھوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے، جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔
(النجم: ۳۱، ۳۲)

آیت کریمہ میں اللَّمَمَ کا جو لفظ آیا ہے اس کے معنی اور مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے جو دو باتیں کہی ہیں انھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کتنی وسیع ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے آیت کریمہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بڑے گناہوں اور فواحش سے بچتے ہیں گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرتے اور اگر کبھی ان سے گناہ صغیرہ کا صدور ہو جاتا ہے تو اللہ اسے معاف فرما دے گا، اس پر پردہ ڈال دے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔ (النساء: ۳۱)

اور اس سے پہلے سورہ النجم کی ۳۲ ویں آیت اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ جو نقل کی گئی ہے اس میں لفظ اللمم مستثنیٰ منقطع ہے، اس لئے کہ اللمم چھوٹے اور معمولی گناہوں کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد ابن کثیرؒ نے وہ حدیث نقل کی ہے جسے امام احمدؒ اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے

عن ابن عباس قال: ما رأیت شیئا اشبہ باللمم مما قال ابو ھریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

ان اللہ تعالیٰ کتب علی ابن آدم حظہ من الزنا، ادرک ذلک لامحالۃ فزنا العین، النظر وزنا اللسان النطق

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے نبی صلعم سے جو روایت بیان کی ہے اس سے زیادہ اور کسی چیز کو میں نے لمم سے مشابہ نہیں پایا۔ ابن آدم کا زنا میں جو حصہ ہے اللہ تعالیٰ نے اسے لکھ دیا ہے اور لامحالہ اسے پا کر رہے گا، پس نگاہوں کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے اور نفس خواہش اور آرزو کرتا ہے

والنفس تتمنی وتشتہی والفرج یصدق ذلک اویکذبہ — اور شرم گاہ اس کی تصدیق کر دیتی ہے یا اسے جھٹلا دیتی ہے۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوہریرہؓ نے اللَّمَمَ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد دیکھنا، اشارہ کرنا، بوس وکنار ہونا ہے جب تک کہ شرم گاہ شرمگاہ سے الگ رہے ورنہ پھر اس کا شمار زنا میں ہو گا۔

حضرت ابن عباسؓ سے "لمم" کی ایک دوسری تفسیر بھی مروی ہے ــ وہ کہتے ہیں کہ آدمی فحش یا برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا شمار لمم میں ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

"اے اللہ تو اگر بخشتا ہے تو سارے گناہوں کو بخش دے، وہ کون بندہ ہے جس سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو"

ابن کثیرؒ نے اس حدیث کو ابن جریر اور ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام ترمذی اس حدیث کو حسن، صحیح، غریب کہتے ہیں۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ اس کا مرفوع ہونا محل نظر ہے۔

اسی طرح کی بات حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حسن سے بھی مروی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ لمم اور الماد اس کام کو کہتے ہیں جسے انسان ہمیشہ نہیں بلکہ سرسری طور پر کبھی کبھی کرتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی کسی سے ملاقات کر کے لوٹ آتا ہے تو کہتے ہیں المممت بہ! تم اس سے ملے، اسی طرح جب مستقل طور سے کسی کام کو نہ کیا جائے بلکہ کبھی کبھی کیا جائے تو کہا جاتا ہے ما فعلتہ الا لماما والماما۔ اس کام کو نہیں کیا مگر کبھی کبھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں کبائر کا ارتکاب مستقل طور سے نہیں کرتے ان کے لئے اللہ کے دین۔ اسلام

میں گنجائش ہے اور جو لوگ توبہ کی راہ اپناتے ہیں اللہ کی مغفرت ان کے تمام گناہوں پر چھا جاتی ہے۔

اسلام کے تربیتی اسباق میں ایک نمایاں اور شاندار سبق وہ ہے جس کی روایت دین کی تعلیم کے سلسلہ میں امیر المومنین حضرت عمرؓ سے بیان کی گئی ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ چھوٹے گناہوں اور معمولی عیوب سے چشم پوشی کر لیتے تھے جب کہ اس کا صدور ایسے شخص سے ہوا ہو جو فرائض کا پابند ہو اور کبائر سے بچتا ہو۔ اس لئے کہ یہاں کوئی معصوم نہیں ہے، ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے، اللہ نے انسانوں کو گناہوں سے پاک فرشتہ بنا کر نہیں پیدا کیا ہے۔

ابن جریر نے ابن عون اور حسن بصری سے روایت کی ہے کہ کچھ لوگ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملے اور کہا: ہم اللہ کی کتاب میں کچھ ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جن پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے اسی سلسلہ میں ہم امیر المومنین سے ملنے کا ارادہ کر رہے ہیں . . . پھر عبداللہ بن عمر اور ان کے ساتھ ہی یہ لوگ امیر المومنین سے ملنے کے لئے آئے۔ پھر جب عبداللہؓ امیر المومنین سے ملے تو امیر المومنین نے پوچھا کب آئے؟

عبداللہؓ: فلاں وقت

امیر المومنین: کیا اجازت سے آئے ہو؟

حضرت حسنؒ کہتے ہیں میں نہیں جانتا کہ اس سوال کا کیا جواب دیا۔

عبداللہؓ: امیر المومنین۔ کچھ لوگ مصر میں مجھ سے ملے اور وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کی کتاب میں کچھ ایسی چیزیں پاتے ہیں جن پر عمل کا حکم دیا گیا لیکن ان پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے، اسی سلسلہ میں ان لوگوں نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

امیرالمومنین ۔ اچھا ان لوگوں کو اکٹھا کرو۔

ابن عون کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو مہمان خانہ میں جمع کیا گیا۔

پھر امیرالمومنین نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو پکڑ کر کہا۔

میں تمھیں اللہ کی قسم اور اسلام کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے پورا قرآن پڑھ لیا ہے؟

ہاں ۔ میں نے پورا قرآن پڑھ لیا ہے۔

تو کیا تم نے قرآن کے مطابق پوری طرح اپنے نفس کو اس کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لیا ہے، اپنی نیت کو درست کر لیا ہے، اپنے دل کو پاک کر لیا ہے اور اپنے نفس کا محاسبہ کر لیا ہے؟

نہیں ۔ (راوی کا بیان ہے کہ اگر جواب ہاں میں ہوتا تو حضرت عمرؓ اس سے بحث کرتے، اسے خاموش کر دیتے)

تو کیا تم نے قرآنی تعلیمات کے سانچے میں اپنی نگاہوں کو، اپنی بات چیت کو اور اپنی چال ڈھال کو اتار لیا ہے؟

پھر یہی سوالات فرداً فرداً تمام لوگوں سے کیا کہ کیا تم لوگوں نے قرآنی تعلیمات کے سانچے میں اپنے ظاہر اور باطن کو اپنے اقوال و اعمال، اپنی حرکات و سکنات کو ڈھال لیا ہے اور ان لوگوں نے کہا، نہیں ۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے کہا۔ تباہی ہو، کیا تم لوگ عمرؓ کو اس بات کا مکلف بنانا چاہتے ہو کہ وہ لوگوں کو تمھاری فہم کے مطابق کتاب الٰہی پر قائم کر دے، جب کہ تم لوگ خود اعتراف کر رہے ہو کہ اس کے احکام کو اپنی زندگیوں میں برپا نہیں کر سکے ہو، ہمارا پروردگار پہلے ہی سے جانتا ہے کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوں گی! پھر آپؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (النساء ۳۱)

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جارہا ہے تو تمھاری چھوٹی چھوٹی برائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ داخل کریں گے

پھر آپؓ نے کہا۔ کیا تمھاری آمد کے مقصد سے مدینہ کے باشندے آگاہ ہو گئے۔

ان لوگوں نے کہا۔ نہیں ہماری آمد کے مقصد سے کوئی آگاہ نہ ہو سکا۔

حضرت عمرؓ۔ اچھا ہی ہوا کہ کوئی آگاہ نہ ہوا، ورنہ میں تم لوگوں کو دوسروں کے لئے سامان عبرت بنا دیتا۔

کتاب الٰہی، قرآن پاک کی صحیح فہم کے ذریعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس قضیہ نامرضیہ کو آغاز ہی میں ختم کر کے شدت پسندی کا ایک دروازہ بند کر دیا۔ ورنہ اگر خدانخواستہ اس میں تساہلی ہو گئی ہوتی تو اس سے فتنہ کی جو آندھی چلتی اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوتا۔

حالات اور ماحول سے آگاہی

اس سلسلہ میں اتنی سوجھ بوجھ تو ہونی ہی چاہئے کہ لوگوں کے معیار، ماحول، عذر اور اسلام مخالف طاقتوں کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں جو کمزوری پائی جاتی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔

یہ بات صحیح نہیں ہوگی کہ ہم عام لوگوں سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ سید الشہداء حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی منزل کے مسافر بن جائیں، ظالم اور سرکش حکمرانوں کے پاس جائیں، انھیں بھلائیوں کا حکم دیں، برائیوں سے روکیں اور ان کا ہاتھ پکڑ لیں تاکہ اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو۔ یہ تو بہت بلند اور قیمتی چیز ہے جس کی مسلمان اپنے لئے تمنا کر سکتا ہے۔

یہ فضیلت کی منزل ہے۔ اسے صرف اولوالعزم ہی حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بہت ہی کم ہیں۔ یہ ایسا فریضہ نہیں ہے جس کا مطالبہ ہر شخص سے کیا جائے اور اس پر ان کا محاسبہ

کیا جائے۔ بہت سے لوگ دور سے کلمہ حق کہہ دینے کو کافی سمجھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی خاموشی کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حرص و ہوس، ترجیح دنیا، نفس پرستی اور خود رائی کے اس دور میں کسی ایسی بات پر جس میں اپنا کوئی دخل نہ ہو ـــــ انکار باللسان یا مذمت میں زبان کھولنے سے کوئی فائدہ نہیں جیسا کہ ابو ثعلبہ الخشنی سے مروی ہے کہ وہ لوگوں کو چھوڑ کر اپنے نفس کو درست کرنے میں لگ گئے۔ کبھی کبھی یہ انکار باللسان کے فائدہ کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن ان کے نتائج کو برداشت کرنے کی اپنے اندر سکت نہیں پاتے۔ لہٰذا برائی کو دل سے برا سمجھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ تغیر اور تبدیلی کا آغاز بنیاد اور جڑ سے ہونا چاہئے نہ کہ چوٹی سے اور اصلاح کے لئے سب سے پہلے افراد کو توجہ کا مرکز بنانا چاہیئے۔ افراد، اگر درست ہو جائیں تو سب کی اصلاح ہو جائے گی، لیکن اس کے برخلاف کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ فاسد نظام ہائے حیات جو مغربی تصورات اور سیکولرزم کی بنیاد پر قائم ہیں، ان میں تغیر اور تبدیلی صرف ایسی اجتماعی جدوجہد سے لائی جا سکتی ہے جس کا ہدف واضح ہو، وسائل درست ہوں، جڑیں گہری ہوں اور اسے لے کر ایسی ہر دل عزیز اسلامی تحریک اٹھے جو جدوجہد کے طویل مراحل سے گزرتے ہوئے تصورات کو مرئی روپ دینے کی ہمت رکھتی ہو، اسی ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ کبھی کبھی کسی برائی پر سکوت اختیار کرنا شرعاً جائز ہی نہیں، مطلوب بن جاتا ہے جب کہ اندیشہ ہو کہ اس کی مخالفت کے نتیجہ میں اس سے بڑی برائی سے دوچار ہونا پڑے گا! بڑی برائی اور بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹی برائی اور چھوٹے نقصان کو گوارہ کرنا پڑتا ہے۔ یہی اہون الشرین کا شرعی قاعدہ ہے ـــ اور اس کی خاص دلیل حضرت ہارون علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور شریک رسالت ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپؑ

کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ رسول بنا کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس بھیجا تھا۔ پھر جب موسیٰؑ ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم بنی اسرائیل میں اپنا جانشین اور خلیفہ بنا کر اپنے رب سے مناجات کے لئے طور پر گئے تو سامری اور اس کے بنائے ہوئے سونے کے بچھڑے کا واقعہ پیش آیا۔ بنی اسرائیل اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۞ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰہٰ : ۹۰-۹۱)

"ہارونؑ نے (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ "لوگو تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمھارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو، مگر انھوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اس کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ ہمارے پاس واپس نہ آجائیں۔"

ہارونؑ اس خطرناک انحراف پر خاموش رہے، شرک اور ایسے بچھڑے کی پرستش سے بھی کوئی بڑا انحراف ہو سکتا ہے، جو نہ ان کی باتوں کا جواب دے سکتا تھا، نہ ان کے نفع نقصان کا مالک تھا اور نہ انھیں زندگی کی سیدھی راہ دکھا سکتا تھا؟

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی اس حرکت پر جب غصے اور غم کی حالت میں واپس آئے اور کہا کہ میرے بعد تم لوگوں نے جو کچھ کیا بہت برا کیا، اور ان حجری تختیوں کو زمین پر ڈال دیا جن پر تورات لکھی ہوئی تھی اور اپنے بھائی ہارون کے سر کے بالوں کو پکڑ کر غصے کی حالت میں اپنی طرف کھینچا اور کہا:

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۞ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۞

"موسیٰؑ نے کہا۔ ہارون جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمھارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟" (طٰہٰ : ۹۲-۹۳)

تو ہارونؑ نے جواب دیا:

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ (طٰہٰ : ۹۴)

"ہارون نے جواب دیا، اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑ نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔"

حضرت ہارونؑ کے اس جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے جماعت کے اتحاد کو زعیم اوّل کی واپسی تک برقرار رکھنے کی بات کو قوم کی گمراہی پر سکوت کے لئے دلیل بنالیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ تم نے جلدی کی۔ قوم میں تفرقہ ڈال دیا اور موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کا انتظار نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث بھی ہے جس کی روایت صحیح بخاری نے کی ہے! اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ام المومنین حضرت عائشہ سے فرمایا: "اگر تمھاری قوم دَورِ شرک سے قریب نہ ہوتی تو میں کعبہ کو ابراہیمؑ کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کرتا۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کام جو آپ کی نظر میں مطلوب تھا، اس اندیشہ سے چھوڑ دیا کہ اس سے یعنی کعبہ کے ڈھا دینے اور از سر نو تعمیر کرنے سے ان لوگوں میں فتنہ برپا ہوگا جن کے دلوں میں اسلام پوری طرح رچا بسا نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سربراہوں کے جور وظلم پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب کہ انھیں اقتدار سے ہٹا دینے اور ان سے بہتر سربراہ کو لانے کی طاقت نہ ہو، صبر کا یہ حکم اس عظیم فتنہ وفساد کے اندیشہ سے دیا گیا ہے جس میں جانیں ضائع جاتی ہیں، عزّتیں لوٹ لی جاتی ہیں، دولت وسرمایہ کی بربادی ہوتی ہے، امن وامان کی فضا درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔

لیکن یہ صبر کا حکم اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ معاملہ صریح کفر اور کھلے ارتداد تک نہیں پہنچتا ہے جیسا کہ عبادۃؓ بن الصامت کی حدیث سے واضح ہوتا ہے جس کی روایت امام بخاری اور امام مسلمؒ نے کی ہے:

الا ان تروا کفرا بواحا عندکم فیہ من اللہ برھان۔

"الا یہ کہ تم کھلے کفر کو دیکھو، جس کے سلسلہ میں تمھارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو"

اور یہیں سے خوابوں کی دنیا میں رہنے والے ان مثالیت پسندوں کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے جو لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے عقائد و عبادات، معاملات اور اخلاق و آداب میں یا تو پورے کے پورے اسلام کو اپنا لیں یا بالکلیہ اسے چھوڑ دیں ان کے نزدیک درمیان میں اسلام کے لئے کوئی مقام اور درجہ نہیں ہے — یا تو مطلق اور کامل اسلام ہے یا پھر اسلام نہیں ہے، اس طرح ان لوگوں نے منکر کو بدلنے کا ایک ہی درجہ تسلیم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے ہاتھ سے بدل دیا جائے۔ اب رہی یہ بات کہ استطاعت اور گنجائش کے مطابق منکر کو زبان اور دل سے بدلا جائے۔ تو یہ لوگ ان درجوں کو ساقط کر دیتے ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

ان لوگوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ اسلامی شریعت میں لوگوں کو ان کی طاقت اور گنجائش کے مطابق مکلّف بنایا گیا ہے۔ نیز سب لوگ طاقت اور صلاحیّت میں یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر تفاوت پایا جاتا ہے حالات اور ظروف بھی الگ الگ ہوتے ہیں اسی لئے شریعت میں عذر اور ضرورت دونوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ اور اس کے لئے خاص احکام ہیں اور اسی کے پیشِ نظر کبھی ممنوع چیزوں کو شریعت مباح قرار دے دیتی ہے اور واجبات کو ساقط کر دیتی ہے۔

اس سلسلہ میں کیا ہی اچھی اور انصاف کی بات امام ابن تیمیہؒ نے کہی ہے:

"درحقیقت قرآن پاک میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ ہر شخص کو اس کی سکت کے مطابق مکلّف بناتا ہے۔"

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا (البقرہ: ۲۸۶)

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَاۤ

جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کئے ہیں اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں (الاعراف ۴۲)

لَا تُکَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَہَا

کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے (البقرہ : ۲۳۳)

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰہَا

اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلّف نہیں کرتا (الطلاق : ۶۵)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم بھی لوگوں کی استطاعت کے مطابق دیا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو (التغابن : ۱۶)

مومن بندے اللہ سے دعا مانگے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ۚ

اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار، جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ (البقرہ : ۲۸۶)

تو ارشاد الٰہی ہوتا ہے :

تمہاری دعاء قبول ہو گئی، تمہاری مانگ پوری کر دی گئی۔

ان نصوص سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جہمیہ جبریہ کی رائے کے برخلاف ایسی چیز کا مکلّف نہیں بناتا، جو اس کے بس اور سکت سے باہر اور جس کے انجام دینے سے وہ عاجز رہ جاتے، نیز اس سے معتزلہ اور قدریہ کی رائے کے خلاف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھول چوک سے کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ اس پر مواخذہ نہیں کرتا اور یہ بات اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی امام، حاکم، عالم یا مفتی اجتہاد کرتا ہے اور استدلال میں حسب استطاعت اللہ کا تقویٰ اختیار

کرتا ہے تو یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ نے مکلّف بنایا ہے اور وہ اللہ کا مطیع مانا جائے گا، یقیناً اللہ اسے سزا نہیں دے گا لیکن جہمیہ جبریہ گروہ اس کے خلاف رائے رکھتا ہے، اس طرح وہ اپنے اجتہاد میں درست اور صحیح مانا جائے گا اس مفہوم میں کہ وہ اللہ کا مطیع ہے۔ باوجودیکہ وہ اپنے اجتہاد میں کبھی صحیح بات کو پالیتا ہے اور کبھی صحیح بات اوجھل رہ جاتی ہے لیکن قدریہ اور معتزلہ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں جو اپنی پوری صلاحیت اور استطاعت صرف کرے گا وہ صحیح بات یا حق کو پالے گا لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو اجتہاد میں اپنی پوری صلاحیت اور سکت کو صرف کرے گا وہ ثواب کا مستحق ہو جائے گا۔

اور اسی طرح کفار کا معاملہ ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت پہنچتی ہے اور اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر جو کچھ آپؐ پر اتار اگیا ہے وہ اس پر ایمان لاتا ہے، حسب استطاعت تقوے کی راہ اپناتا ہے جیسا کہ نجاشیؓ وغیرہ نے کیا تھا۔ لیکن اسے نہ ہجرت کا موقع ملتا ہے اور نہ پوری شریعت کو اپنانے کا، اس لئے کہ ہجرت اور اپنے دین کے اعلان سے اسے روک دیا گیا ہے اور اس کے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہیں ہے جو اسے پوری شریعت کی تعلیم دے سکے، تو ایسا شخص مومن اور جنّتی ہے جیسا کہ فرعون کی قوم کے کے ساتھ رہنے والے ایک مومن کا ذکر آیا ہے یا جیسے فرعون کی بیوی تھی۔

یہی کیفیت نجاشی کی ہے وہ اگرچہ عیسائیوں کا بادشاہ تھا لیکن اس کی قوم نے اسلام قبول کرنے کے سلسلہ میں ساتھ نہیں دیا۔ نجاشی کے ساتھ صرف چند آدمیوں نے اسلام قبول کیا، اسی لئے جب نجاشی کی وفات ہوگئی تو وہاں کوئی جنازہ کی نماز پڑھنے والا بھی نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے جنازے کی نماز مدینہ میں پڑھائی۔
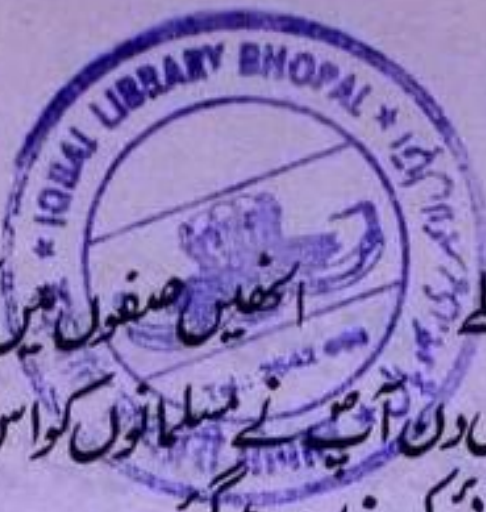
آپؐ مسلمانوں کو لے کر نماز جنازہ کے لئے باہر نکلے انھیں صفوں میں کھڑا کیا اور نماز پڑھائی. جس دن نجاشی کی موت ہوئی اسی دن آپ صلعم نے مسلمانوں کو اس کے مرنے کی خبر دی اور کہا حبشہ میں تمھارے ایک صالح بھائی کی وفات ہوگئی۔

نجاشی کو مجبوری کے باعث شریعت کے بہت سے احکام پر عمل کا موقع نہیں مل سکا، نجاشی نے نہ ہجرت کی، نہ جہاد کیا، نہ خانہ کعبہ کا حج کیا بلکہ روایت تو یہ بھی کی گئی ہے کہ اس نے نہ فرض نمازیں پڑھیں، نہ رمضان کے روزے رکھے، نہ شرعی زکوٰۃ ادا کی۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں ظاہر ہو جاتیں تو اس کی قوم اسے ناپسند کرتی اور وہ ان کی مخالفت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور ہم یقینی طور پر یہ بات جانتے ہیں وہ ان کے درمیان قرآن کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کر سکتا تھا جب کہ اللہ نے اپنے رسول پر مدینہ میں یہ لازم کر دیا تھا کہ اگر اہل کتاب آپؐ کے پاس اپنے جھگڑے لائیں تو آپؐ قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ جو احکام آپؐ پر اتارے گئے ہیں ان میں سے بعض مثلاً زنا کی سزا رجم، اور دیت اور قصاص وغیرہ کے معاملے میں اہل کتاب آپؐ کو فتنہ میں مبتلا کر دیں۔

نجاشی رض کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قرآنی احکام کے مطابق فیصلے کرے اگر وہ ایسا کرتا تو اس کی قوم برداشت نہ کرتی، بسا اوقات ایک شخص مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان قضا اور امامت کے منصب پر مقرر ہوتا۔ اس کے دل میں عدل وانصاف کا جذبہ بھی ہوتا تھا لیکن حالات وظروف کے باعث وہ اسے بروئے کار نہیں لا سکتا تھا۔ وَلَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ نے عدل وانصاف قائم کرنے کی کوشش کی، تو ان کی مخالفت کی گئی، اذیت پہنچائی گئی بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انھیں زہر

دے دیا گیا۔ پس نجاشی اور اسی طرح کے لوگ جنّت میں خوش بخت ہوں گے۔ اگرچہ ان لوگوں نے اسلامی شریعت کی جن چیزوں کو اپنانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، ان کو نہیں اپنا سکے بلکہ یہ ایسے احکام کے تحت فیصلے کرتے تھے جن کے ذریعہ فیصلے کرنے کی انھیں قدرت حاصل تھی۔

تکوینی قوانین میں غور و فکر

غور و فکر کے لئے یہ ضروری ہے کہ طبعی اور شرعی قوانین میں جو تدریج پائی جاتی ہے اس کا دھیان رکھا جائے اور اتنی مدّت تک صبر کیا جائے جو کسی چیز کے پختہ ہونے اور آخری مرحلہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور یہ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کی فطرت اور خاص طور سے نوجوانوں کی طبیعت میں جلد بازی ہوتی ہے یہ جلد بازی جو ہمارے زمانہ کا مزاج بنی ہوئی ہے۔ بہت سے دین پسند پرجوش نوجوان چاہتے ہیں کہ آج ایک پودا لگائیں تو کل اس کا پھل حاصل کرلیں، صبح میں بیج بوئیں تو شام میں کٹائی کرلیں اور یہ بات فراموش کردیتے ہیں کہ اللہ کے بنائے ہوئے طبعی قوانین ان کے اس ارادہ کو قبول نہیں کرسکتے بلکہ شدت سے رد کردیتے ہیں۔ گٹھلی، پھل دار درخت نہیں بنتی ہے جب تک کہ وہ اپنی نوعیت، ماحول وغیرہ کے لحاظ سے مختصر یا طویل مراحل سے گزر نہ جائے ان مرحلوں سے گذر کر ہی وہ اللہ کے حکم سے پھل دیتی ہے۔

جنین کی تخلیق کا آغاز نطفہ سے ہوتا ہے۔ پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے پھر بوٹی کا روپ دھارتا ہے۔ پھر اسے ہڈیوں کا روپ دیا جاتا ہے، پھر اس پر گوشت و پوست چڑھایا جاتا ہے اور اسے ایک نئی صورت دی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ زندہ بچّہ کے روپ میں باہر آتا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المؤمنون: ۱۴) پس بڑا بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر

بچہ جب ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو رضاعت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، پھر دودھ چھڑایا جاتا ہے، پھر لڑکپن کا دور شروع ہوتا ہے، پھر بلوغت کا دور آتا ہے، پھر زندگی شباب سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ اس طرح زندگی تدریج کے ساتھ اپنی تمام صورتوں میں آگے بڑھتی ہے، مختلف مرحلوں سے گذرتی ہے یہاں تک تخلیق کے باب میں اللہ کی سنت پوری ہو جاتی ہے، اسی طرح ہمارے دین کا آغاز ہوا، سب سے پہلے آسان عقیدہ کی تعلیم دی گئی، پھر اللہ نے دھیرے دھیرے احکامات اتارے اور اس سے آگاہ کیا کہ کیا چیزیں فرض ہیں اور کیا حرام ہیں، اسی طرح تدریج سے پوری شریعت کو اللہ نے کھول کھول کر بیان کر دیا۔ یہاں تک تعمیر مکمل ہو گئی اور نعمت پوری ہو گئی اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لئے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے

کچھ دین پسند پرجوش نوجوان اپنے ہم رنگ نوجوانوں کے پاس اکٹھا ہوتے ہیں، پھر مسلمانوں کی زبوں حالی پر شکوہ سنج ہوتے ہیں، رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں، پھر خود ہی ایک جماعت کی تشکیل کر لیتے ہیں تاکہ جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اس کی اصلاح ہو سکے اور شرف و عظمت کی منہدم عمارت کی تعمیر ہو سکے۔ پھر تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، حسین خوابوں میں اس طرح غرق ہو جاتے ہیں کہ بیداری میں بھی خواب دیکھتے رہتے ہیں اور یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ حق کو قائم کرنے اور باطل کے مٹا دینے پر قادر ہو گئے ہیں، ایک صبح یا شام میں وہ صفحۂ

زمین پر اسلامی حکومت قائم کر دیں گے، راہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو بھول جاتے ہیں حالانکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جو امکانات اور وسائل ان کے پاس ہوتے ہیں اگرچہ وہ کم سے کم ہوتے ہیں لیکن وہ اسے بہت زیادہ سمجھنے لگتے ہیں ــ ان لوگوں کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے ابن سیرینؒ سے کہا:

میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں پانی کے بغیر تیر رہا ہوں اور پروں کے بغیر اُڑ رہا ہوں تو میرے خواب کی تعبیر کیا ہے؟

ابن سیرینؒ نے کہا:

تم ایک ایسے آدمی ہو جس کی تمنّائیں اور آرزوئیں بہت ہیں۔ یعنی تم تمنّاؤں کی دنیا میں رہنے والے ہو۔

اللہ راضی ہو حضرت علیؓ سے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

ایاك والاتكال على المنى فانها بضائع النوكى.	خبردار آرزوؤں پر ٹیک نہ لگانا یہ تو احمقوں کی پونجی ہے

اور کیا ہی سچی بات ہے جو ایک شاعر نے پہلے ہی کہی ہے:

ولا تكن عبد المنى فالمنى رؤوس اموال المفاليس

"آرزوؤں کے غلام نہ بنو آرزو تو مفلسوں کا راس المال ہے"

یہ حقیقت ہے کہ بدحالی کو اچھی آرزوؤں اور تمنّاؤں سے نہیں بدلا جا سکتا قوموں اور سماجوں کی تبدیلی اور تغیّر کے سلسلہ میں اللہ کے کچھ قوانین ہیں ـــ یہ قوانین کسی کی جانب داری نہیں کرتے . . .

شامی مفکر استاذ جودت سعید نے اسی موضوع پر ایک بہت اچھی کتاب لکھی ہے کتاب کا نام ہے "حتی یغیروا ما بانفسهم" یہ نام قرآن پاک کی

درج ذیل دو آیتوں سے ماخوذ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد: ۱۱)	حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو بدل نہیں دیتی
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الانفال: ۵۳)	یہ اللہ کی اس سنّت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم پر عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی

یہ کتاب قرآن پاک کی روشنی میں ایک عمیق نفسیاتی اجتماعی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بحث کے آغاز میں مصنّف نے کہا ہے:

عالم اسلام میں ایسے نوجوان موجود ہیں جو اسلام کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن ان میں بہت ہی کم ایسے نوجوان ملیں گے جو اپنی عمر کے چند سالوں کو سنجیدہ مطالعہ اور تحقیق میں لگانے کے لئے تیار ہوں تاکہ ذہنوں میں پختگی پیدا ہو اور حقائق کھل کر سامنے آجائیں، مثلاً آج مسلمانوں کی عملی زندگی اور عقیدہ میں جو انفصال پایا جاتا ہے یا اسی طرح کے دوسرے سوالات جو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا کوئی صحیح جواب نہیں۔ حالانکہ جب تک ان کا صحیح اور ایجابی جواب سامنے نہ آجائے تب تک حالات کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، لیکن یہ صحیح اور مثبت جواب تو گہرے اور وسیع مطالعہ ہی سے مل سکتا ہے۔

اسی قسم کے تحقیقی مطالعہ کی سست رفتاری کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اسلامی سماج میں ابھی تک اس کی قدر و قیمت نمایاں ہو کر سامنے نہیں آسکی یہ سماج ایک لمبی مدت سے یہی رائے رکھتا ہے کہ تلوار کی زبان کتاب سے زیادہ سچی ہوتی ہے

السیف اصدق انباء من الکتب "تلواروں کی خبریں کتابوں سے زیادہ سچی ہوتی ہیں"

اور اس کا یہ رخ نہیں رہا ہے کہ بہادروں کی بہادری سے پہلے صحیح اور صائب رائے تک پہنچنا ضروری ہے۔ الرأي قبل شجاعة الشجعان

یہ مختلف رائیں گھنی تاریکیوں میں پڑی رہیں اور یہ معلوم ہی نہیں کیا گیا کہ ان رائیوں میں باہمی ربط کیا ہے اور ان میں فطری ترتیب کیا ہے؟

اسی طرح دنیائے اسلام میں ابھی تک ایمان کی شرطوں کا بھی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکا ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اسلام اور ایمان کے ارکان کی حفاظت نہیں کی اور اسے فراموش کر دیا ہے بلکہ ایمان کی شرطوں سے ہماری مراد نفسیاتی شرطیں ہیں۔ یعنی وہ تغیّرات اور تبدیلیاں جو داخلی اور نفسیاتی سطح پر ناگزیر اور مطلوب ہیں۔ اس لئے کہ یہی تبدیلیاں ایمان کے ثمرات سے ہم کنار کرتی ہیں اس ضمن میں وہ ساری چیزیں آجاتی ہیں جن کا تعلق عقیدہ اور عمل میں ہم آہنگی اور مطابقت کی شرطوں سے ہے اسی طرح اس میں وہ رکاوٹیں بھی آجاتی ہیں جو عقیدہ سے حاصل ہونے والے ثمرات کے لئے روک بن جاتی ہیں۔

ابھی تک ہمارے یہاں اسی بات پر نگاہ رہتی ہے کہ جان و مال کی قربانی بڑے اونچے درجے کی قربانی ہے لیکن ان باتوں کی رعایت نہیں رکھی جاتی جو اس قربانی کو نفع بخش بنا دیتی ہیں۔ حالانکہ معاملہ صرف ایثار و قربانی ہی کا نہیں ہے اس لئے کہ قربانی سے اس کے نتائج کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی فنی شرطوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہی نقطہ نظر نوجوانوں کے اندر جان و مال کی قربانی کے لئے مددگار تو بن جاتا ہے لیکن یہ انھیں پڑھنے، سمجھنے اور مطالعہ کے لئے مسلسل جدوجہد پر آمادہ نہیں کر پاتا۔

یہاں اس کا ایک سبب اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ جان و مال کی قربانی جوش و

ہیجان کے ایک لمحہ میں پوری ہوسکتی ہے لیکن علم کا حصول جوش وخروش کے کسی ایک لمحہ میں پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے تو مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ مسلسل جد وجہد ایک ذہنی بیداری چاہتی ہے۔ یہی بیداری اس کے لئے ایندھن کا کام دیتی ہے اور مسلسل جد وجہد پر آمادہ رکھتی ہے۔

ہاں یہاں بہت سے نوجوان ایسے بھی ہیں جو پرجوش لمحات میں مختلف موضوعات پر ایک ساتھ درس اور مطالعہ کا پروگرام بنا لیتے ہیں لیکن ایک دو یا چند نشستوں کے بعد جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، اکتاہٹ کا دور شروع ہو جاتا ہے اور پروگرام اسی طرح رک جاتا ہے جیسے تیل ختم ہونے پر چراغ بجھ جاتا ہے۔

پس ضروری ہے کہ رکاوٹ ڈالنے والے اس نقطہ نظر کا مطالعہ کیا جائے مطالعہ کی راہ میں غفلت یا مطالعہ کا پروگرام شروع کرنے کے بعد پروگرام کی راہ میں روک بننے والے اسباب کو سامنے لایا جائے۔ اس لئے کہ یہ چیزیں جان ومال کی قربانی کو نفع بخش بنانے والی باریک اور اہم شرطوں کے ضمن میں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن سطحی اور عاجلانہ غور وفکر کی نگاہ سے یہ پوشیدہ رہتی ہیں۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ ہم بڑے شوق سے حالات کو بدلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ تبدیلی اس وقت تک ظہور میں نہیں آسکتی جب تک کہ خود ہمارے اندر تبدیلی نہ پیدا ہو لیکن ہم تو اپنے حالات پر مطمئن ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ جن حالات کو ہم بدلنا چاہتے ہیں اس کی بقا کا کافی سامان ہمارے اندر پرورش پا رہا ہے کبھی کبھی ہم ان حالات کے بوجھ کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن ہمیں ایسی بہت سی چیزوں کا احساس نہیں ہوتا جو خود ہمارے اندر ہیں اور ان حالات کو ہمیشگی اور دوام بخشنے میں اپنا حصّہ ادا کر رہی ہیں۔

یہی وہ بات ہے جس سے قرآن پاک سارے انسانوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے، جب وہ ان کی دشواریوں اور مشکلات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کا منبع خود انسان کی ذات ہے اور ان کا تعلق کسی باہر کے ظلم سے نہیں ہے بلکہ یہ وہ ظلم ہے جسے خود انسان نے اپنے اوپر آپ کیا ہے، اور یہی تاریخ کا مغز ہے اور یہی وہ قانون اجتماع ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور اسی سے غفلت کے نتیجہ میں زندگی ظلم کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور وہ فلسفے پیدا ہوتے ہیں جن کے اندر مایوسی اور نامرادی کی روح ہوتی ہے یا وہ فلسفے جنم لیتے ہیں جن کے اندر تسلط اور دین سے بغاوت اور سرکشی کی روح ہوتی ہے۔

انسان نے اپنے اوپر سب سے بڑا جو ظلم کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اس تسخیری تعلق کو فراموش کر دیا ہے جو انسان، سماج اور کائنات یا انفس و آفاق کے درمیان پایا جاتا ہے، وہ گوشہ گیر ہو گیا ہے اور اپنے آپ کو اس تسخیری مقام پر نہیں رکھا جہاں سے انفس و آفاق کی فطری قوانین کی بنیاد پر تسخیر ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشکلات کے سلسلہ میں عقل انسانی دو میں سے ایک موقف اختیار کر سکتی ہے۔ ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان دشواریوں اور مشکلات کے سلسلہ میں یہ فرض کیا جائے کہ یہ دشواریاں اور مشکلات کچھ فطری قوانین کے تابع ہیں۔ انھیں مسخر کر کے دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے یا پھر یہ فرض کیا جا سکتا ہے ـــ کہ یہ دشواریاں اور مشکلات نہ کسی فطری یا طبعی قانون کے تابع ہیں اور نہ ان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ـــ پھر ان دونوں موقفوں کے درمیان بھی متعدد مواقف ہیں ـــ ان دونوں بنیادی موقفوں سے ان کی دوری اور قربت میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

ان دونوں مفروضوں میں سے جو بات بھی فرض کی جائے ان کے کچھ عملی نتائج

سامنے آتے ہیں اور ان کا ظہور لوگوں کے موقف اور رویہ کے مطابق مختلف صورتوں میں ہوتا ہے جو جس موقف سے جتنا گہرا یا ہلکا تعلق رکھتا ہے اسی کے مطابق اس کے نزدیک ان نتائج میں بھی تفاوت نظر آتا ہے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق زندگی گذارنے میں مسلمانوں کا عاجز رہ جانا ان کے لئے ایک ایسا مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے جسے ثابت کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد کہ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے یہ بات باقی رہتی ہے کہ مسلمان اس کے سلسلہ میں کیا موقف اپناتے ہیں۔ آیا وہ پہلے موقف کو اپناتے ہیں کہ یہ دشواریاں کچھ قوانین کے تابع ہیں۔ ان کو معلوم اور مسخر کر کے مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے یا وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ مشکلات کسی ایسے قانون کے تابع نہیں جس کا پتہ لگایا جاسکے اور نہ ان قوانین کی تفتیش کے سلسلہ میں جدوجہد کا کوئی فائدہ ہے۔ اس لئے کہ یہ قوانین کچھ لوگوں کے یقین کے مطابق انسانی زندگی پر پوشیدہ طور پر جادو کی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس موضوع کو مسلمانوں کے سامنے اس طرح رکھنا چاہئے کہ وہ ان مشکلات کے سلسلہ میں ایک واضح موقف اپنا سکیں اور اس غیر واضح اور الجھے ہوئے موقف سے الگ ہو جائیں جسے وہ کبھی کبھی اپنا لیتے ہیں۔ بسا اوقات یہ دونوں موقف آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں ادر اس طرح موضوع غیر واضح ہو کر رہ جاتا۔

کسی مسئلہ کے حل تک پہنچنے کے لئے نظریہ کی درستگی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ بلکہ نظریہ کی صحت اور وضاحت ہی پر حل کا دار و مدار ہوتا ہے۔

کامیابی کے قوانین اور شرائط

شدت پسندوں میں سے ایک آدمی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ کیا ہمارے دشمن اور مخالف باطل پر نہیں ہیں۔

میں نے کہا: ہاں ہم حق پر ہیں اور ہمارے مخالف باطل پر ہیں۔

اس نے کہا: کیا ہمارے رب نے وعدہ نہیں کیا ہے کہ وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی اور کفر کے مقابلہ میں ایمان کی مدد کرے گا۔ میرے رب کا وعدہ تو سچا ہے؟

میں نے کہا: ہاں میرے رب کا وعدہ سچا ہے اور وہ ہرگز اس کے خلاف نہیں کرے گا۔

اس نے کہا: پھر ہم انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ باطل کے ساتھ معرکہ کیوں نہیں شروع کرتے؟

میں نے کہا: ہمارے دین نے یہ تعلیم دی ہے کہ کامیابی کے لئے کچھ قاعدے اور قوانین ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے کچھ شرطیں ہیں جن کا پورا کرنا ناگزیر ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکی زندگی کے آغاز ہی میں بت پرستی کے خلاف عسکری جہاد کا اعلان کر دیتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ آپؐ خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھیں اور اس کے چاروں طرف بت ہوں۔

اس نے کہا: یہ قوانین اور قواعد و شرائط کیا ہیں؟

میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کی مدد صرف اس بنیاد پر نہیں کرتا ہے کہ وہ حق ہے بلکہ وہ حق کی مدد اہل حق کے ذریعہ کرتا ہے۔ ان مومنین کے ذریعہ کرتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی بنیاد پر اخوت کے رشتہ کو استوار کر کے اکٹھے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے اپنے رسولؐ سے کہا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے

(الانفال: ٦٢)

اس نے کہا: کہاں ہیں وہ فرشتے جو حق کو عزت بخشنے اور باطل کو ذلّت سے ہم کنار کرنے کے لئے مدد لے کر اترتے ہیں؟ وہی فرشتے جو بدر، خندق اور حنین کی جنگوں کے موقع پر اترے تھے؟

میں نے کہا: فرشتے موجود ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے حق کی کامیابی کے لئے مدد لے کر اتریں لیکن یہ فرشتے اس کام کے لئے خلا میں نہیں اترتے۔ وہ مدد لے کر ان مومن بندوں کے پاس آتے ہیں جو جد وجہد کرتے ہیں، زمین پر سرگرم عمل ہوتے ہیں اور اپنی ثابت قدمی کے لئے آسمانی مدد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں قرآن کا ارشاد ہے:

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ

اور وہ وقت جب تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔

(الانفال: ١٢)

پس اس سلسلہ میں سب سے پہلے اَلَّذِیْنَ اٰمنو کا وجود ضروری ہے یہاں تک کہ وہ فرشتوں کے اترنے کے اہل بن جائیں۔

اس نے کہا: اگر اہل ایمان پائے جائیں تو مدد آئے گی؟

میں نے کہا: صرف پایا جانا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کی اشاعت کے لئے، اپنے پیام کی تبلیغ کے لئے، اپنی تعداد کو بڑھانے کے لئے سرگرم عمل رہیں، نیز اپنے میدان کار کو وسیع کرنے۔ مخالفین پر

حجت قائم کرنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے جدو جہد میں لگے رہیں، یہاں تک کہ ان کے پاس اتنی طاقت آجائے کہ وہ اس کے ذریعہ دشمنوں کا سامنا کر سکیں ورنہ یہ بات نہ عقلاً قابل قبول ہے نہ شرعاً کہ ایک آدمی سو یا ہزار آدمیوں کا مقابلہ کرے۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک نے جو زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی ہے وہ یہ ہے کہ مومن گروہ کا ایک فرد کافر گروہ کے دس افراد کا مقابلہ کرسکتا ہے

إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ

(الانفال : ۶۵)

اگر تم میں بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر دو سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے

اور یہ بات قوت اور عزیمت کی حالت میں ہے، ضعف اور رخصت کی حالت میں نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ

(الانفال ۶۶)

اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں

اس نے کہا: لیکن دشمن اہل حق کو یہ موقع کب دیتے ہیں کہ وہ اپنے افکار اور پیام کی اشاعت کریں اور امانت کو ادا کر دیں۔ مخالفین تو ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ ان کے سامنے تاریکیاں پھیلاتے ہیں، ان کے پاؤں کے نیچے سرنگیں بچھاتے ہیں۔

میں نے کہا: ہاں! یہاں بھی ایک شرط ہے۔ آسمانی مدد اور کامیابی کا مستحق بننے کے لئے اس کا پورا کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تکلیفوں، دشواریوں اور چیلنجوں کے مقابلہ میں پوری راہ میں صبر و ثبات کا رویّہ اپنانا چاہیئے، صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اِعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ — جان لو اللہ کی مدد صبر کے ساتھ وابستہ ہے

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے چند مکی صورتوں کے خاتمہ پر اپنے رسولؐ کو صبر کی ترغیب دی ہے:

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ

تم اس ہدایت کی پیروی کئے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جارہی ہے اور صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (سورہ یونس: ۱۰۹)

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

اے نبیؐ صبر سے کام کئے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقوی سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں (سورۃ النحل: ۱۲۷-۱۲۸)

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ﴿٦٠﴾

پس (اے نبیؐ) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے (سورۃ الروم: ۶۰)

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ

پس اے نبی صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو (سورۃ الاحقاف: ۳۵)

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ

اے نبی اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو (سورۃ الطور ۴۸)

میرے ساتھی نے کہا: صبر کی یہ مدت تو کبھی بہت طویل ہو سکتی ہے، پھر ایسی اسلامی حکومت کب قائم ہو گی جو اسلامی شریعت کو نافذ کرے، امت کو زندہ کرے اور زمین پہ اسلامی علم کو بلند کرے۔

میں نے کہا: کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے ہاتھوں کوئی جاہل زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو جائے۔ کوئی گم کردہ راہ تمہارے ذریعہ راہ راست پالے یا کوئی گنہ گار تائب ہو جائے؟ یا... یا....؟

اس نے کہا: کیوں نہیں؟ ایسا ہو سکتا ہے!

میں نے کہا: پھر تو یہ بہت بڑی کمائی ہے، بہت بڑا سرمایہ ہے، ہر وہ فرد جسے تم جاہلیت کی دلدل سے نکال کر اسلام کی شاہراہ مستقیم پہ ڈال دیتے ہو وہ ہمیں ہماری منزل سے قریب کر دیتا ہے بلکہ وہ خود ہی ایک ہدف ہے جو حاصل ہو جاتا ہے صحیح حدیث میں آیا ہے:

لأن يهدي بك رجلا واحدا خير لك من حمر النعم۔

اگر خدا تمھارے ہاتھ سے ایک آدمی کو ہدایت دیدے تو وہ سرخ اونٹوں سے تمھارے لئے بہتر ہے

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہماری جو ذمہ داری ہے

جس کا ہم سے حساب لیا جائے گا، وہ یہ ہے کہ ہم سرگرم عمل رہیں، دعوت اور تربیت کا کام کرتے رہیں، یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اسے کامیابی کی منزل سے ہم کنار بھی کر دیں۔ ہماری ذمہ داری صرف بیج بونے کی ہے، پیداوار کی امید ہمیں اپنے رب سے لگا رکھنی چاہیئے۔

. . . . اللہ ہم سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ تم نے کامیابی کیوں نہیں حاصل کی؟ لیکن وہ ہم سے پوچھے گا کہ ہم سرگرم عمل کیوں نہیں رہے؟

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

اور اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمھارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

(التوبہ : ۱۰۵)

فصل چہارم

مسلم نوجوانوں کے لئے مخلصانہ نصیحتیں

رمضان ۱۴۰۱ھ میں میرے جو مضامین رسالہ "الامۃ" میں 'اسلامی بیداری' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے ان کے خاتمہ پر میں نے دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا تھا۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ بیداری ایک فطری اور صحت مند بیداری ہے اور یہ فطرت اور اصل کی طرف واپسی کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے مسلم ممالک میں یہ حیثیت صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔ اسلام کو مسلم ممالک سے دیس نکالا دینے والوں نے چاہے جتنی کوشش کی ہو یا اسلام کے بارے میں لوگوں کو گم راہ کرنے والوں نے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام ہی ہمارے لئے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اسی سے ہماری ابتدا ہے اور وہی ہماری انتہا ہے، شدید پریشانی اور سخت دشواری کے مواقع پر جب راستے گڈمڈ ہو جاتے ہیں مایوسی کی فضا چھا جاتی ہے تو لوگوں کو دین کے علاوہ اور کہیں پناہ نہیں ملتی وہ دین کی طرف بھاگتے ہیں اور اسی کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں اسی سے وہ توانائی حاصل کر کے روح کو توانا بناتے ہیں۔ امیدوں کو زندہ رکھتے ہیں اور

زندگی کی آرزو حاصل کرتے ہیں اسی سے راستے کی روشنی اور روشن راستہ حاصل کرتے ہیں

ہمارے سماج نے مغرب اور مشرق سے درآمد کئے ہوئے حلوں کو آزمالیا لیکن اس کی کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی، نہ فرد کی اصلاح ہوئی، نہ سماج کو ترقی ملی، نہ دین کی بھلائی ہوئی، نہ دنیا کی آبادکاری ہوئی۔ ان درآمد کئے ہوئے حلوں سے پسپائیوں، ہزیمتوں اور بکھراؤ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوا، آج بھی ان کے آثار نگاہوں کے سامنے ہیں۔

پھر ایسی حالت میں اگر دنیائے اسلام میں اسلامی حل کی طرف لوٹنے کی آواز بلند ہو اور رائے عامہ زندگی کے ہر میدان میں شریعت کی تنفیذ کا مطالبہ کرے اور نوجوان جن کے اندر جوش و جذبہ ہوتا ہے اور جو سیاست کی نرمی اور نرم سیاست پر یقین نہیں رکھتے ہیں اس سلسلہ میں اپنا پارٹ ادا کرنے کی کوشش کریں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

یہاں ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ ان نوجوانوں میں جو شدّت اور قطعیت پائی جاتی ہے اس کا علاج تشدّد نہیں ہے اور نہ دھمکی سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ تشدد سے ان کی شدّت پسندی کو اور بڑھاوا ملے گا، دھمکی سے ان کی ضد اور بڑھے گی، اس شدت پسندی کا علاج تہمتیں تراش کر اور تشکیک کی فضا بنا کر بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو ان نوجوانوں کے اخلاص میں اور تعلق باللہ میں شک رکھتا ہو، سب ہی لوگوں کی نگاہ میں یہ سچے ہیں اور اللہ سے ان کا تعلق سچائی پر مبنی ہے۔

اس شدّت پسندی کا علاج ان لوگوں سے دور ہو کر نہیں بلکہ قریب ہو کر کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افکار اور موقف کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا، ان کے محرکات اور نیتوں کے

تئیں حسنِ ظن رکھنا ہوگا اور اس کھائی کو پاٹنا ہوگا جو ان کے اور سماج کے درمیان پیدا ہوگئی ہے اور اچھے ڈھنگ سے ان کے ساتھ علمی گفتگو کرنی ہوگی تاکہ مفہوم اور مطالب واضح ہوجائیں، شبہات دور ہوجائیں، نزاعی باتیں متعین ہوجائیں اور یہ معلوم ہوجائے کہ کن باتوں پر اتفاق ہے اور کن میں اختلاف ہے۔

تعمیری گفتگو

اسی تعمیری گفتگو کے پیشِ نظر میں نوجوانوں کے سامنے لوجہ اللہ چند سفارشیں اور نصیحتیں پیش کر رہا ہوں۔ دین نصح اور خیر خواہی کا نام ہے، اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں تعلیم دی ہے، یہ نصح و خیر خواہی اللہ، اللہ کے رسول، اللہ کی کتاب، ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے لئے ہونی چاہئے، مومن، مومن کا آئینہ ہوتا ہے اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ دنیا اور آخرت کے خسارے سے نجات کا ذریعہ ہے۔

ان نصیحتوں سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں راہ میں نشان لگا دوں، یہ نشانات منزل کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے، ٹھوکروں سے بچائیں گے، سفر منقطع نہ ہونے دیں گے۔ ہدف سے ادھر ادھر نہ جانے دیں گے اور نفس یا ذات کو محور بنانے کی راہ میں روک بن جائیں گے۔

امتیاز و تخصص کا احترام

ان نوجوانوں کے لئے میری اولین نصیحت یہ ہے کہ انھیں تخصص کا احترام کرنا چاہئے ہر علم و فن کے کچھ عالم اور ماہر ہوتے ہیں جس طرح یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ ایک انجینئر طب کے بارے میں یا ایک طبیب قانون کے بارے میں اپنا فتویٰ صادر کرے، بلکہ اس سے بھی آگے اگر کسی طبیب نے طب کی کسی شاخ میں تخصص حاصل کیا ہے تو اسے طب کے دوسرے دائرے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

اسی طرح پوری شریعت ہر ایک کے لئے مباح نہیں کہ جو چاہے دخل دے، اور یہ دعویٰ کرے کہ اسلام کسی گروہ کی جاگیر نہیں ہے اور دوسرے ادیان کی طرح اسلام میں دین کے پروہتوں کا کوئی طبقہ مخصوص نہیں ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اسلام میں پروہتوں یا رجال دین کا کوئی طبقہ نہیں ہوتا لیکن اسلام علمائے متخصصین کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے انہیں علماء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ

مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے (التوبہ: ۱۲۲)

قرآن پاک اور سنت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جن چیزوں کا ہمیں علم حاصل نہ ہو، ان کے بارے میں مخلص اور تجربہ کار علماء سے رجوع کریں۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو جاننے والے سے پوچھ لو (الانبیاء: ۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ

حالانکہ اگر یہ اسے رسولؐ اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں (النساء: ۸۳)

فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا — اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھ لو (الفرقان: ۵۹)

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ — حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمھیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا (فاطر: ۱۴)

ایک صحابیؓ جن کے سر میں زخم تھا، انھوں نے اپنے ساتھ کے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ انھیں طہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے تو اس زخم کی حالت میں وہ غسل کریں یا نہ کریں؟ ان لوگوں نے زخم کے باوجود یہ فتویٰ دیا کہ غسل واجب ہے۔ چنانچہ صحابیؓ نے غسل کر لیا اور پھر انتقال ہو گیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

قتلوہ قتلھم اللہ ھلا سألوا اذا لم یعلموا فانما شفاء العی السوال! — اللہ انھیں تباہ کرے ان لوگوں نے اسے مار ڈالا اگر یہ لوگ مسئلہ نہیں جانتے تھے تو جاننے والوں سے کیوں نہیں پوچھا نادانی کا علاج پوچھنا ہی تو ہے۔

اور یہ دیکھ کر تو میں اندیشہ اور خوف محسوس کرنے لگتا ہوں کہ انتہائی نازک اور خطرناک مسائل اور اہم معاملات میں وہ لوگ فتویٰ دینے اور احکام صادر کرنے کی جرأت کرتے ہیں جن کے اندر فتویٰ دینے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی اور کبھی کبھی تو یہ ماضی اور حال کے جمہور علماء کی مخالفت کرتے ہیں اور انھیں خاطی اور جاہل گرداننے لگتے ہیں اور اپنے بارے میں یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ مقلد نہیں ہیں اجتہاد کرنا ان کا حق ہے اور اجتہاد کا دروازہ سب ہی کے لئے کھلا ہوا ہے اگرچہ ان لوگوں کی یہ بات صحیح ہے لیکن اجتہاد کے لئے کچھ شرطیں ہیں اور یہ شرطیں ان میں سے کسی کے اندر نہیں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے اسلاف میں علمائے محققین نے اپنے دور کے بعض علماء پر اس لئے

نکتہ چینی کی ہے کہ وہ کافی غور و فکر اور تحقیق کے بغیر فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں علمار محققین نے جو نکتہ چینی کی ہے اس میں سے ایک یہ ہے "ان میں بعض افراد ایسے مسئلہ میں فتویٰ دیتے ہیں کہ اگر وہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اس کے حل کے لئے اہل بدر کو جمع کر کے رائے مشورہ کرتے"، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "تم میں سے فتویٰ دینے پر جو زیادہ جری ہے وہ جہنم کی سزا پر زیادہ جری ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے"۔

خلفائے راشدین کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ اس وسیع علم و فضل کے باوجود جس سے اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو نوازا تھا صحابہؓ اور علمار صحابہؓ کو جمع کرتے، ان سے مشورہ کرتے۔ ان کی رایوں سے روشنی حاصل کرتے، اسی قسم کے اجتماعی فتوؤں سے قرن اوّل میں اجماع کی نشو و نما ہوئی۔

ان بزرگوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو فتویٰ دینے سے توقف فرماتے خود جواب دینے کے بجائے دوسروں کے حوالہ کر دیتے یا کہتے میں نہیں جانتا۔ عقبہ بن مسلم کا ارشاد ہے کہ میں چونتیس ماہ تک ابن عمرؓ کے ساتھ رہا۔ بیشتر مسائل میں جو اُن سے پوچھے جاتے۔ وہ جواب دیتے "میں نہیں جانتا"۔

ابن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ میں سے ایک سو بیس انصار صحابہؓ سے مجھے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ ان میں سے جب کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ دوسرے کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہتے۔ دوسرا کسی اور کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہتا۔ یہاں تک کہ گھوم پھر کر پھر وہیں پہنچ جاتا، جہاں سب سے پہلے پوچھا تھا۔ ان میں سے جب کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو اس کی تمنا یہی ہوتی تھی کہ کاش اس کا کوئی بھائی یہ بار گراں اٹھا لیتا۔

حضرت عطاء بن السائب کہتے ہیں میں ایسے لوگوں سے ملا ہوں کہ جب ان میں سے کسی سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ جواب دیتے تھے اور بدن پر کپکپاہٹ طاری رہتی تھی۔

اور جب ہم تابعینؓ کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس گروہ کے سردار اور سب سے بڑے فقیہ حضرت سعید بن المسیبؒ جب کوئی فتویٰ دیتے تھے تو یہ ضرور کہتے تھے۔ بارے الٰہا مجھے محفوظ رکھ اور مجھ سے لوگوں کو محفوظ رکھ۔

تابعینؓ کے بعد ہم ان ائمہ کرام کو دیکھتے ہیں جن کے مسلک کی پیروی کی جاتی ہے۔ یہ بزرگ ائمہ بھی جن سوالوں کے بارے میں اچھی طرح معلومات نہیں رکھتے تھے، ان کے بارے میں لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنے میں ان کی عظمت اور بڑائی روک نہیں بنتی تھی۔ یہ امام مالکؒ ہیں، اس سلسلہ میں ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ یہ کہتے تھے۔ جس کسی سے مسئلہ پوچھا جاتا ہے جواب دینے سے پہلے اسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو جنّت اور دوزخ پر پیش کرے اور یہ دیکھے کہ آخرت میں نجات کیسے ہوگی۔ پھر مسئلہ کا جواب دے۔

ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا کہ دس سال سے زائد مدت سے ایک مسئلہ میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک صحیح رائے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔

ابن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا ہے کہ بسا اوقات میرے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا جاتا ہے اور میں اسی مسئلہ میں غور و فکر کرتے ہوئے پوری رات گزار دیتا ہوں۔

مصعب کہتے ہیں: میرے والد نے ایک مسئلہ کے سلسلہ میں مجھے امام مالکؒ کے
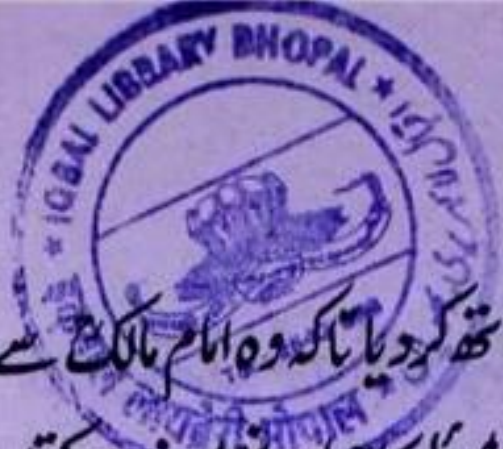
پاس بھیجا اور جو صاحب مسئلہ لے کر آئے تھے انھیں بھی ساتھ کر دیا تاکہ وہ امام مالکؒ سے بیان کر دیں، امام مالکؒ نے ان کی بات سن کر کہا میں اس مسئلہ کا جواب نہیں دے سکتا، اہلِ علم سے پوچھئے۔

ابن ابی حسان کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے بائیس مسئلے پوچھے گئے امام مالکؒ اس اثنا میں کثرت سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتے رہے اور صرف دو مسئلوں کا جواب دیا۔

میں مسلم نوجوانوں کو پڑھنے لکھنے سے نہیں منع کر رہا ہوں، تعلیم کا حاصل کرنا تو ایک فریضہ ہے، مہد سے لحد تک اس کا جاری رکھنا مطلوب ہے لیکن میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی انھیں ماہرین فن یا اہل اختصاص کی ضرورت پڑے گی، اس لئے کہ شرعی علم یا دینی علم کے لئے بھی کچھ ذرائع یا وسائل ہیں، جنہیں وہ پوری طرح حاصل نہیں کر سکے ہیں، کچھ اصول ہیں۔ نہ ان کا احاطہ کر سکے، نہ پوری طرح ان سے آگاہی حاصل کر سکے، کچھ فروع اور مکملات ہیں لیکن ان نوجوانوں کے اوقات و مشاغل انھیں فرصت نہیں دیتے کہ یہ ان کی طرف متوجہ ہوں ۔ ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے اور وہ اسی طرف دیکھ رہا ہے اور جو جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے لئے آسان بنا دی گئی ہے۔

کالجوں میں۔ لٹریچر، تجارت، طب اور انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے والے بعض طلبا نے شریعت میں تخصص حاصل کرنے کے لئے اپنی تعلیم منقطع کر دی، میں ان طلبہ کے اس رویہ کو پسند نہیں کرتا خصوصاً جب کہ ان لوگوں نے اپنی تعلیم کے کئی مرحلوں کو تفوق اور امتیاز کے ساتھ طے کر لیا تھا کیا یہ لوگ اس بات کو نہیں جانتے ہیں یا اسے جان کر فراموش کر دیا ہے کہ ان علوم میں تفوق اور امتیاز حاصل کرنا بھی مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میدانوں میں مسلمانوں

اور ان کے مخالفین کے درمیان بہت سخت مقابلہ ہے ایسی حالت میں اگر کوئی شخص خلوص نیت سے ان دنیاوی علوم کو گہرائی کے ساتھ حاصل کرتا ہے تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی عبادت اور جہاد میں لگا ہوا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت ہوئی تو صحابہ کرامؓ مختلف دھندوں میں مشغول رہتے ہوئے اپنی روزی حاصل کرتے تھے تو جو لوگ جس جائز دھندے میں لگے ہوئے تھے آپ نے انھیں ان سے ہٹایا نہیں اور نہ ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ دھندوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو علم دین یا دعوت کی اشاعت کے لئے پوری طرح فارغ کرلیں۔ البتہ جس کو کسی مہم کے لئے طلب کیا جاتا تھا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے دل کو اس مہم کے لئے آمادہ کرے۔

لیکن اب جو تبدیلی آئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کے پس پردہ حلقوں اور مجلسوں میں نمایاں ہونے کی چھپی ہوئی خواہش نہ ہو۔ بسا اوقات اس خواہش کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن یہ دل کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہے اور ضرورت ہے کہ بڑی باریکی سے اس کی چھان بین کی جائے۔ نفس برائیوں کا حکم دیتا ہے، اور اس تک پہنچنے کے لئے شیطان کے راستے بہت ہیں اور باریک بھی ہیں — پس توفیق اسی انسان کو ملتی ہے جو ان خطرناک چوراہوں پر رک جائے اور خود اپنے نفس کا جائزہ لے، اپنے محرکات اور اقدامات کا جائزہ لے کہ کیا یہ سب کچھ دنیا کے لئے ہے یا آخرت کے لئے؟ اللہ کی رضا کے لئے ہے یا لوگوں کی رضا کے لئے؟ تاکہ اپنے نفس کو دھوکہ میں مبتلا کئے بغیر سیدھی راہ پر اپنے رب کی ہدایت و دلائل کے اجالے میں رواں دواں رہے۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔ (آل عمران: ۱۰۱)

متقی اور اعتدال پسند رہنما

اگر چہ ہر علم کے کچھ عالم اور ماہر ہوتے ہیں لیکن مسلم نوجوانوں کے لئے یہ میری نصیحت ہے کہ وہ دین کا علم ان ثقہ علمار سے حاصل کریں جو علم کی وسعت، تقویٰ اور میانہ روی کے جامع ہوں۔ دینی علم کی اساس اور بنیاد کتاب وسنّت ہے لیکن جو شخص کتاب وسنّت کو سمجھنا چاہتا ہے وہ مفسرین کی تفسیروں سے، شارحین حدیث کی شرحوں سے اور فقہار کی فقہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ انھیں بزرگوں نے کتاب وسنت کی خدمت کی ہے اصول وفروع مرتب کئے ہیں اور ہمارے لئے ایک عظیم دینی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس سے اعراض وہی کر سکتا ہے جو نادان ہو یا فریب نفس میں مبتلا ہو۔

پس جو شخص کتاب وسنت کے علم کا مدعی ہو اور علمائے امت پر طعن بھی کرتا ہو اس پر دین کی تعلیم کے سلسلہ میں اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص قرآن و حدیث کے دلائل کو نظرانداز کر کے علمار اور مختلف متداول فقہی مسلکوں کی کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے تو وہ دین کی اصل اور بنیاد اور شریعت کے منبع ومصدر کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

کچھ علمار ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اسلامی علوم کی بعض شاخوں میں متخصص کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً تاریخ، فلسفہ، تصوف۔ لیکن ان کا تعلق کتاب وسنت سے براہ راست نہیں ہوتا تو ایسے علمار سے ان کے مخصوص فن میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نہ یہ فتویٰ دینے کے اہل ہیں اور نہ ان سے دین کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی گفتگو اور تقریر میں جادو جگاتے ہیں۔ جمہور سامعین کو متاثر کرنے اور دل کے تاروں کو چھیڑنے کی اچھی

صلاحیت رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ علمی تحقیق کے میدان کے بھی سورما ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو کھرے اور کھوٹے کو، اصل اور نقل کو، حقیقت اور خرافات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں، بسا اوقات ان پر مسائل مشتبہ ہو جاتے ہیں اور بغیر علم کے فتویٰ دے دیتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اسی طرح کون سی بات کس مرتبے کی ہے۔ یہ تعین مراتب کا مسئلہ بھی ان کے ذہنوں میں خلط ملط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں یہ چھوٹی چیزوں کو بڑی اور بڑی چیزوں کو چھوٹی، حقیر کو عظیم اور عظیم کو حقیر بنا دیتے ہیں اور ان کے اچھے اسلوب اور ساحرانہ خطابت سے مسحور سامعین یہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن سے علم اور مسائل حاصل کئے جا سکتے ہیں حالانکہ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وعظ و خطابت ایک فن ہے اور فقہ و تحقیق دوسرا فن ہے اور ہر وہ انسان جو ان میں سے کسی ایک فن میں مہارت رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فن میں بھی ماہر ہو۔

نیز دین کا علم ان ہی عالموں سے حاصل کرنا چاہیئے جو باعمل ہوں اور اسی کی تعبیر ہم نے تقویٰ سے کی ہے، جس کی بنیاد اللہ کی خشیت ہے جو حقیقی علم کا پھل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ (فاطر: ۲۸)

یہ تقویٰ اور خشیت ہی وہ چیز ہے جو عالم کو روک دیتی ہے کہ وہ اللہ کے نام سے کوئی بات بغیر علم کے کہے یا اپنے علم کو کسی نظام یا سلطان کی خدمت میں لگا کر اپنی آخرت کو دوسروں کی دنیا کے لئے فروخت کر دے۔

اس دور میں جن لوگوں سے دین کا علم حاصل کرنا چاہئے ان کے لئے تیسری لازمی صفت اعتدال ہے اور یہ اعتدال دین اسلام کا ایک امتیاز ہے۔ ہمارا دور بھی عجیب ابتلاء کا دور ہے۔ اس دور میں علم سے نسبت رکھنے والے دو متقابل گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں کچھ لوگوں میں افراط اور غلو کا رجحان پایا جاتا ہے تو کچھ لوگوں کے اندر تفریط اور دینی احکام کے تئیں ڈھیل کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی لئے حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ دین میں غلو کرنے والوں اور دین سے اعراض کرنے والوں کے باعث دین ضائع ہو جاتا ہے چنانچہ ان میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو بعید نہیں کہ لوگوں کے ہر چیز کو حرام قرار دے دیں اور ان کے مقابلہ میں کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو لوگوں کے لئے ہر چیز مباح اور جائز بنا دیتے ہیں، ان میں وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو کسی متعین فقہی مذہب کی تقلید کو واجب قرار دیتے ہیں اور اجتہاد کے دروازے کو بند کر دیتے ہیں، دوسری طرف وہ افراد پائے جاتے ہیں جو تمام فقہی مذاہب پر طعن کرتے ہیں ان کی کوششوں اور اجتہادات کو دیوار پر پھینک مارتے ہیں۔

ان ہی لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ظاہری نصوص کو اپناتے ہیں لیکن نہ مقاصد پر نظر ڈالتے ہیں اور نہ قواعد کا خیال رکھتے ہیں، ان کے مقابلہ میں وہ تاویل پسند ہیں جو ہر نص کو آٹے کی لوئی بنا دیتے ہیں کہ جو معنی اور مضمون چاہیے اس سے ڈھال لیجئے۔

حالانکہ علماء کی جو صنف مطلوب ہے اور جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ، وہ صنف ہے جس کے اندر غلو اور آزاد روی کے مقابلہ میں میانہ روی اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ جس کی عقل فقیہوں جیسی اور دل متقیوں جیسا ہو اور

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عملی زندگی میں پائے جانے والے بگاڑ کو درست کرسکتا ہو۔ نیز جو یہ فرق کر سکے کہ خواص کیا امید رکھتے ہیں، کیا چاہتے ہیں اور عوام کن دشواریوں سے دوچار ہیں، نیز وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اختیار اور وسعت کی حالت کے احکام اور ہیں اور ضرورت کے احکام اور، آسان طلبی اسے اتنا آگے نہ بڑھا دے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان حائل پردوں ہی کو ختم کر دے اور نہ احتیاط کے نام پر، اسے اللہ کے بندوں کو سختیوں اور دشواریوں سے دوچار کرنا چاہیئے۔ حضرت سفیان ثوری کو حدیث، فقہ، اور تقویٰ میں امامت کا مرتبہ حاصل ہے اللہ کی ان پر رحمت ہو، ان کا ارشاد ہے ثقہ علماء کی طرف سے ملنے والی رخصت علم ہے اب رہی بات شدت پسندی کی تو اس کے ماہر تو سبھی ہیں۔

دشواریاں نہیں آسانیاں

مسلم نوجوانوں کے لئے میری تیسری نصیحت یہ ہے کہ انھیں غلو اور سختی سے اپنے آپ کو الگ کر لینا چاہیئے، اعتدال اور نرمی کے پہلو کو اپنانا چاہیئے۔ خصوصاً عام لوگوں کے سلسلہ میں جو ان چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتے جنھیں خواص، متقی اور پرہیزگار افراد برداشت کر لیتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک مسلمان کسی ایک مسئلہ میں یا جملہ مسائل میں اپنے لئے وہ پہلو اپنائے جس میں زیادہ احتیاط اور سلامتی پائی جاتی ہے لیکن اگر وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے یہی "زیادہ احتیاط" ہی کا راستہ اپنائے اور آسانی کی راہ بالکل چھوڑ دے تو دین احتیاطی مشکلات کا مجموعہ ہو کر رہ جائیگا جس میں صرف شدت اور سختی ہی پائی جائے گی حالانکہ اللہ اپنے بندوں کے لئے وسعت اور آسانی چاہتا ہے۔

جو لوگ کتاب وسنت کی نصوص، سیرت نبوی ؐ اور سیرت صحابہ رضؓ پر

نگاہ ڈالیں گے وہ یہ جان لیں گے کہ یہ چیزیں آسانی کی طرف بلاتی ہیں، دشواریوں کو دور کرنے کی دعوت دیتی ہیں، یہ چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندوں پر سختی اور شدت پسندی کا رویہ اپنانے سے دور رہا جائے۔

روزہ کے احکام کو بیان کرنے کے بعد قرآن کا ارشاد ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ — اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا (البقرہ ۱۸۵)

طہارت کے بیان کے سلسلہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ — اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا (المائدہ ۶)

نکاح کے احکام کے سلسلہ میں نازل ہونے والی آیتوں کے آخر میں اللہ نے فرمایا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا — اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے (النساء: ۲۸)

قصاص کے سلسلہ میں معافی اور صلح کی اجازت دیتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ — یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے (البقرہ: ۱۷۸)

اب رہی بات احادیث کی تو اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے جو روایتیں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں وہ کافی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دین میں غلو سے بچو۔ تم سے پہلے کے لوگ دین میں غلو کرنے کے باعث ہلاک ہو گئے۔ یہ حدیث صحیح اسناد کے ساتھ امام احمد النسائی، ابن ماجہ اور الحاکم نے روایت کی ہے۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

(سکت اور صلاحیت سے بڑھ کر) حد سے زیادہ غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی اور اس کا تعلق قول و عمل اور رائے تینوں سے ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ ایک دیہاتی نے ایک بار مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا لوگ اس کی طرف روکنے کے لئے بڑھ ہی رہے تھے کہ آپؐ نے فرمایا:

اسے چھوڑ دو، اور ایک ڈول پانی لا کر بہا دو۔ تمہیں آسانی پیدا کرنے کے لئے اٹھایا گیا ہے سختی کے لئے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ جب دو باتوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا آپؐ کو اختیار دیا جاتا تو آپؐ اسی کو چنتے جس میں زیادہ آسانی ہوتی جب کہ وہ گناہ نہ ہو۔ (متفق علیہ)

جب لوگوں نے آپؐ سے حضرت معاذؓ کی لمبی قرأت کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا معاذؓ تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو۔ یہ بات آپؐ نے تین بار دہرائی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر سختی کرنا اور ہمیشہ ان سے عزیمت کا مطالبہ کرنا ان کے لئے فتنہ کا سبب بن جاتا ہے۔

اگر ایک شخص اکمل و اسلم کی طلب میں اپنے اوپر سختی کرتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ عام لوگوں پر بھی سختی کرے، اس طرح وہ غیر شعوری طور پر ان کو دین سے متنفر کر دے گا، اسی لئے جب آنحضرت صلعم تنہا نماز پڑھتے

تھے تو آپؐ کی نماز سب سے لمبی نماز ہوتی تھی لیکن جب آپؐ امامت فرماتے تھے تو آپؐ کی نماز ہلکی ہوتی تھی، اسی سلسلہ میں آپؐ کا ارشاد ہے:

اذصلی احدکم للناس فلیخفف، فان فیہم الضعیف والسقیم والکبیر، واذاصلی احدکم لنفسہ فلیطول ماشاء (متفق علیہ)

جب تم میں سے کوئی امام ہو تو اسے ہلکی نماز پڑھانی چاہئے اس لئے کہ مقتدیوں میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں۔ اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو وہ نماز کو جتنی طویل کرنا چاہے کرے۔

وعن ابی قتادۃ انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: إنی لاقوم الی الصلوٰۃ، وارید ان اطول فیہا، فاسمع بکاء الصبی فاتجوز فی صلاتی کراھیۃ ان اشق علی اُمہ

حضرت ابوقتادہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:
میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نماز کو لمبی کروں کہ بچّے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں نماز کو ہلکی کر دیتا ہوں کہ کہیں اس کی ماں پر شاق نہ ہو۔

امام مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں اس تخفیف کی صورت یہ بیان کی ہے کہ آپؐ ایسے مواقع پر چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقت کے باعث لوگوں کو صوم وصال سے منع کیا۔ لوگوں نے کہا لیکن آپؐ تو بغیر افطار کے مسلسل روزہ رکھتے ہیں، آپؐ نے جواب دیا۔ لیکن میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے (متفق علیہ)

آسانی اگرچہ ہر زمانہ میں مطلوب رہی ہے لیکن ہمارے اس دور میں تو یہ اور زیادہ ضروری اور مطلوب ہو گئی ہے۔ آج دین کا رشتہ کمزور ہو چکا ہے ——

یقین میں پختگی باقی نہیں ہے — لوگوں پر مادی زندگی کا غلبہ ہو چکا ہے — بہت سے منکرات عموم بلوی کا اس طرح روپ دھار چکے ہیں گویا وہ زندگی کی بنیاد ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شاذ ہے۔ آج دین سے وابستہ رہنا انگاروں کو پکڑنے کے مترادف ہے۔ یہ ساری چیزیں آسانی اور نرمی کی متقاضی ہیں، اسی لئے فقہاء نے کہا ہے۔ مشقت آسانی کو لاتی ہے۔ معاملات کی تنگی وسعت کی طالب ہوتی ہے اور عموم بلوی تخفیف کا موجب ہوتا ہے۔

اچھائی اور دانائی کی راہ

دین دار مسلم نوجوانوں کو میری چوتھی نصیحت یہ ہے کہ انھیں دین کی تبلیغ اور مخالفین کے ساتھ بحث و مباحثہ میں وہ راہ اپنانی چاہیئے جس کی نشان دہی قرآن پاک نے کی ہے اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے سورۃ النحل کی آخری آیتوں میں بیان کیا گیا ہے تاکہ ہم آپؐ کے بعد آپؐ کی سیرت سے ہدایت حاصل کرتے رہیں۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ (النحل: ۱۲۵)

اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔

جو شخص آیت کریمہ میں غور و فکر سے کام لے گا وہ اس حقیقت کو پالے گا کہ بحث و مباحثہ کے لئے صرف اچھے طریقہ کو اپنانے کی تلقین پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ حکم ہے کہ اس کے لئے زیادہ اچھا طریقہ اپنایا جائے۔ پس اگر یہاں بات چیت اور گفتگو کے لئے دو طریقے موجود ہوں، ایک اچھا اور دوسرا اس سے بھی زیادہ اچھا۔ تو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بحث و گفتگو کیلئے

زیادہ اچھے طریقے کو اپنائے، جس کی تعبیر لفظ احسن سے کی گئی ہے یہ زیادہ بہتر طریقہ برگشتہ دلوں کو موہ لیتا ہے اور لوگوں میں اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا کرتا ہے۔

کسی طریقہ کا احسن طریقہ ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بحث و مباحثہ اور گفتگو کے دوران جن باتوں پر اتفاق ہو، اسے ذہن میں رکھا جائے اور پھر اختلافی امور پر بات چیت کی جائے ہو سکتا ہے کہ ان اختلافی امور میں بھی اتفاق کی راہ نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۴۶﴾

(العنکبوت: ۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں — اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔

اب رہیں اختلافی باتیں تو اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن اللہ ہی کرے گا۔

وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۶۸﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۶۹﴾

(الحج: ۶۸، ۶۹)

اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے، اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

جب غیر مسلموں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں ایک مسلمان کا یہ اسلوب ہوتا ہے تو مسلمانوں کے ساتھ کیسا اسلوب اپنانا چاہئے۔ جب کہ دونوں کا عقیدہ ایک ہے اور دونوں کے اندر دینی اخوت کا رشتہ پایا جاتا ہے، بعض بھائی اعلان حق اور اسلوب کی سختی کو خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں

ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم نہیں ہیں، سمجھ دار مبلغ وہی ہے جو اپنی پوری دعوت کو دوسروں تک نرمی سے پہنچا دے۔ واقعات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب کی سختی سے اچھی بات بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو لوگوں کو نیکی اور معروف کا حکم دیتا ہے تو چاہئے کہ اس کا حکم بھی معروف ڈھنگ سے ہو۔

امام غزالی نے اپنی کتاب "احیاء العلوم الدین" میں لکھا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اسی کو انجام دینا چاہئے۔ جس کے اندر نرمی، بردباری اور دین کی سوجھ بوجھ پائی جاتی ہو۔

اسی سلسلہ میں امام غزالیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لئے عباسی خلیفہ مامون کے پاس گیا اور پھر بہت تند وتیز لہجہ میں بات کی اور اس کا خیال نہیں رکھا کہ ہر جگہ کے لئے ایک بات ہوتی ہے اور وہی اس جگہ کے لئے مناسب ہوتی ہے لیکن مامون سمجھ دار تھا، اس نے کہا، ارے بھائی یہ کیا ہے، ذرا نرمی سے کام لو، اللہ تعالٰی نے اس شخص کو بھیجا تھا جو آپ سے زیادہ بہتر تھا اور اس شخص کے پاس بھیجا تھا جو مجھ سے زیادہ برا تھا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے نرم لب ولہجہ اپنانے کا حکم دیا تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تھا، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ آپ سے زیادہ بہتر تھے اور فرعون مجھ سے زیادہ برا تھا لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو ان الفاظ میں نصیحت کی: اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے، اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرلے یا ڈر جائے، (طہٰ: ۴۳-۴۴)

مامون نے اس آدمی کو خاموش کر دیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں موسیٰؑ کو جو ہدایت دی تھی وہ یہ تھی کہ فرعون تک دعوت پہنچانے کے لئے گفتگو کا نرم لہجہ اپنائیں۔

فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ۝ اور اس سے کہہ کہ کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے
وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ۝ اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اسکا) خوف تیرے اندر پیدا ہو
(النازعات: ۱۸-۱۹)

فرعون کے ساتھ موسیٰؑ کی گفتگو کا قرآن پاک میں جو ذکر ہے جو شخص بھی اس سے آگاہ ہوگا وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موسیٰؑ نے پروردگار کی ہدایات کو دل و دماغ میں رچا بسا لیا تھا اور فرعون کی سرکشی اور تکبّر، تہمت تراشیوں اور دھمکیوں کے باوجود بڑی دانائی اور باریکی سے ان ہدایتوں پر عمل کیا، سورۃ الشعراء کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور دعوتی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ آپ کی دعوتی زندگی میں شدّت پسندی، سنگ دلی اور سختی کے مقابلہ میں رفق، رحمت اور نرمی کا پہلو غالب تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ اللہ نے آپ کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۝ دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ایمان لانے والوں کیلئے وہ شفیق اور رحیم ہے
(التوبہ: ۱۲۸)

اسی طرح صحابہ کرام سے آپؐ کے تعلقات کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۝ (اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے
(آل عمران: ۱۵۹)

بعض یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے ہوئے زبان کو مروڑ کر السلام علیکم کی جگہ السام علیکم کہا، اس طرح موت کی دعا کر کے اپنے چھپے ہوئے بغض کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عائشہؓ اس پر بہت زیادہ ناخوش ہوئیں اور سخت جواب دیا لیکن آنحضرت صلعم نے صرف وعلیکم کہنے پر اکتفا کیا۔ پھر آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ

اللہ ہر معاملہ میں نرمی پسند کرتا ہے دین و دنیا کی تمام باتوں میں، قول و عمل میں اللہ کو نرمی پسند ہے (متفق علیہ)

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مسلم کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر جو اجر دیتا ہے وہ سختی پر یا کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔

مسلم ہی میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت آتی ہے کہ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے اسے زینت مل جاتی ہے اور جس چیز سے نرمی ختم ہو جاتی ہے اس میں بگاڑ آجاتا ہے۔ اس حدیث میں جو عمومیت ہے اس نے ہر چیز کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو رفق سے محروم ہوتا ہے وہ ساری بھلائیوں سے محروم ہوتا ہے" مسلم اس سے بڑی اور سخت سزا کیا ہوگی کہ انسان ساری بھلائیوں سے محروم ہو کر رہ جائے۔

میرا خیال ہے کہ نصوص کی یہ مقدار میرے ان بچوں کو مطمئن کر دینے کے لئے کافی ہوگی جنھوں نے حملہ آوری اور شدت پسندی کو اپنا نشان بنا رکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ شدت پسندی کی راہ چھوڑ کر حکمت و موعظت حسنہ کی راہ اپنا لیں گے۔

دعوت اور گفتگو کے آداب

اب میں دعوت اور گفتگو کے سلسلے میں چند نقاط پر زور دینا چاہتا ہوں. اس سلسلہ میں ان نقاط کی بڑی اہمیت ہے۔

۱- ماں باپ اور رشتہ داروں کے حق کی رعایت ضروری ہے۔ ماں باپ سے خشونت کے ساتھ نہیں پیش آنا چاہیئے اور نہ بھائی بہنوں سے سختی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اس بنیاد پر کہ یہ لوگ گنہگار، بدعتی یا حق سے منحرف ہیں۔ ان لوگوں کا یہ حق ہے کہ ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کی جائے اور خاص طور سے والدین کا یہ حق گنہگار یا بدعتی ہونے سے ساقط نہیں ہو جاتا۔

ماں باپ کے حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا

لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرلے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔ (لقمان: ۱۵)

یہاں شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے سوا اس کے کہ مومن کو مشرک بنانے کی کوشش کی جائے اور جب اس گناہ کا صدور والدین سے ہو تو اللہ نے ان کی اطاعت سے روک دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ ان کے ساتھ معروف طریقہ سے رہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کے ساتھ جو دعوتی بات چیت کی ہے اور جس کا ذکر سورہ مریم میں آیا ہے، جو شخص اس کا مطالعہ کرے گا وہ اچھی طرح جان لے گا کہ بچوں کو ماں باپ کے ساتھ دعوتی بات چیت میں کن آداب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ چاہے یہ ماں باپ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔

پھر یہ ماں باپ اگر مسلمان ہوں تو گنہگار ہونے اور مخالفت کرنے کے باوجود ان کا پدری حق تو ہے ہی، اسلام نے جو حق انھیں دیا ہے وہ بھی باقی رہتا ہے۔

ثانیاً کبر سنی کے حق کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ سن و سال کے اس فرق کو ختم نہیں کرنا چاہیئے اور نہ بڑوں اور چھوٹوں سے مخاطبت کا یکساں طریقہ اپنانا چاہیئے اور نہ بڑوں

کے ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیئے جو نوجوان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ اسلام تمام لوگوں کو مساوی قرار دیتا ہے لیکن مساوات کا یہ غلط مفہوم ہے کہ کسی کے خاص حق کا خیال نہ رکھا جائے۔ اسلام عام حقوق اور انسانی عزت ووقار کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان مساوات کا اعلان کرتا ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ خاص حقوق، مثلاً رشتہ داروں کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق، پڑوسی کے حقوق اور سربراہوں کے حقوق کی رعایت کی جائے۔

یہ اسلامی آدابِ زندگی ہیں کہ چھوٹا بڑے کا احترام کرے اور بڑا چھوٹے کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

وہ شخص ہم میں سے نہیں، جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا ہمارے بڑوں کی عزت نہیں کرتا اور ہمارے علماء کا حق نہیں پہچانتا (الطبرانی، الحاکم)

امام احمدؒ نے عبادہؓ بن الصامت سے یہی حدیث روایت کی ہے لیکن اس میں لفظ لیس منا (ہم میں سے نہیں) کی جگہ لیس من امتی یعنی وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

وہ ہم میں سے نہیں، تاویل کرنے والوں نے اس فقرہ کی جو بھی تاویل کی ہے لیکن ان تاویلوں کے باوجود اس برأت سے اور سخت چیز کیا ہو سکتی ہے؟

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "سفید ریش مسلم کی عزت کرنا، اللہ کی تعظیم اور احترام میں سے ہے۔" (ابوداؤد، التیسر للمناوی)

ثالثاً۔ سبقت کے حق کی رعایت! جس کو دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت میں اور لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے میں سبقت کی فضیلت حاصل ہے اور جس نے دین کی نصرت میں ہر نرم گرم کو برداشت کیا ہے، دین کی بھرپور مدد کی ہے تو اس کی اس فضیلت کا انکار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اس کے سابقہ کارناموں پر مٹی ڈالنی چاہیئے اور نہ اسے طعن و تشنیع کا اس

بنیاد پر نشانہ بنانا چاہیئے کہ اس میں چستی کے بعد سستی آگئی ہے یا قوت کے بعد ضعف پیدا ہوگیا ہے۔ استقامت کے بعد کوتاہی کا مرتکب ہوگیا۔ اس لئے کہ اس کے پاس خیر کا سرمایہ ہے اور جہاد کے میدان میں اسے جو سبقت حاصل ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کے حق میں سفارش کرتی ہیں کہ اس کے سابقہ کارناموں کا انکار نہ کیا جائے۔

یہ بات میں اپنے جی سے گھڑ کر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ وہ بات ہے جو حضرت حاطب رضؓ بن ابی بلتعہ کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے جبکہ ان سے ایک لغزش ہوگئی تھی اور یہ لغزش بھی خیانت کے مشابہ تھی۔ انھوں نے قریش مکہ کے نام ایک خط لکھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فتح مکہ کے لئے جو تیاری کی تھی اس خط میں اہل مکہ کو اس کی اطلاع دی گئی تھی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ پوری کوشش تھی کہ اس تیاری کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔ اسی لئے جب یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا، اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیجئے، میں اس کی گردن اڑا دوں، یہ تو منافق ہوگیا ہے۔ لیکن نبی کی شان کریمی سے جو جواب ملا، وہ یہ تھا۔

عمر رضؓ تمہیں کیا خبر، اللہ بدر والوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ تبھی تو اس نے کہا، جو چاہو کرو، میں نے تم لوگوں کو معاف کر دیا۔

اعملوا ما شئتم فانی قد غفرت لکم

بیشک حاطب رضؓ بن ابی بلتعہ کے سابقہ کارناموں نے، بدر کے معرکہ میں ان کی شرکت نے، دربار نبوت میں ان کے لئے وہ منزلت حاصل کر لی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے عذر کو قبول کر لیا اور اپنے ساتھیوں سے ان کے بارے میں وہی بات کہی جو بدر والوں کے سلسلے میں آپ کہتے تھے۔

عام لوگوں میں گھل مل کر رہو

نوجوانوں کے لئے میری پانچویں نصیحت یہ ہے کہ وہ مثالیت اور خوابوں کے آسمان سے اتر کر حقیقت کی سر زمین پر آئیں، لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہیں کسان، مزدور، کاریگر، محنت کش اور جدوجہد کرنے والے افراد اور مجاہدین سے ملیں، شہر کی گنجان بستیوں، محلوں گلیوں اور گاؤں میں جائیں، یہیں انھیں اچھی فطرت اور اچھے دل کے انسان ملیں گے۔ یہیں انھیں محنت سے نڈھال جسموں سے ملاقات ہوگی۔

نوجوانوں کے لئے یہ میری نصیحت ہے کہ وہ ان لوگوں کے پاس جائیں — ناخواندہ لوگوں کو خواندہ بنانے میں حصہ بٹائیں تاکہ وہ پڑھنے لگیں۔ مریضوں کے علاج میں ہاتھ بٹائیں تاکہ وہ صحت سے ہمکنار ہوں۔ ٹھوکر کھا کر گرنے والوں کو تقویت پہنچائیں تاکہ وہ کھڑے ہو جائیں۔ بیکار لوگوں کے لئے امدادی کاموں میں حصہ لیں تاکہ ان کی محتاجی دور ہو جائے۔ پس ماندہ افراد کی ذہنی تربیت میں حصہ لیں تاکہ یہ لوگ آگے بڑھ سکیں۔ عاصیوں اور خطا کاروں کو سمجھائیں کہ وہ گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیں کہ وہ سیدھی راہ پر آجائیں — منافقوں کا پردہ چاک کریں کہ وہ روپوش ہو جائیں، رشوت خوروں کا پیچھا کریں یہاں تک کہ وہ رشوت خوری سے باز آجائیں، مظلوموں کو انصاف دلائیں کہ ان کے اندر از سر نو زندگی کا نشاط پیدا ہو۔

ناخواندگی کو ختم کرنے کے لئے زکوٰۃ کو جمع اور تقسیم کرنے کے لئے لوگوں کے اندر صلح و صفائی کے لئے، امراض کے خلاف جنگ کے لئے، سگریٹ نوشی اور نشہ آور اشیا سے لوگوں کو بچانے کے لئے، بری عادتوں کو مٹانے اور اچھی عادتوں کو پھیلانے کے لئے نوجوانوں کو کمیٹیاں بنانا چاہیئے۔

یہاں کتنے ہی میدان عمل ہیں جو نوجوانوں کی جدو جہد کی، نوجوانوں کے عزائم کی نوجوانوں کے جوش و خروش کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

نوجوانو! اپنی قوم کو چھوڑ کر صرف اپنی ذات کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بناؤ۔ یہ آپ کے آباؤ اجداد ہیں، ماں باپ ہیں، بھائی بہن اور رشتہ دار ہیں۔ قوم کے پاس آؤ، انھیں کے ساتھ مل جل کر رہو، ان کے غم کو اپنا غم سمجھو، ان کے دکھ درد کو بٹاؤ، غمزدوں کا سہارا بنو، یتیموں کے آنسوؤں کو پوچھو، مسکینوں کے چہروں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرو، تھکے ماندوں کے بوجھوں کو ہلکا کرو، پریشان حالوں کی مدد کرو، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کرو، غمگین دلوں کے زخموں کا علاج کرو، اپنے عمل سے یا اچھی بات کہہ کر یا اپنی سچی مسکراہٹ سے

سماج کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہونا، اسے مدد دینا خصوصاً سماج کے کمزور گروہوں کی مدد کرنا، اونچے درجہ کی عبادت ہے۔ لیکن آج کے دور میں بہت سے مسلمان اسے اچھے ڈھنگ سے انجام نہیں دیتے۔ باوجودیکہ اسلام کی تعلیمات، بھلائی کے کاموں کو انجام دینے کی دعوت دیتی ہیں۔ خیر کے کاموں کو مرئی روپ دینے کا حکم دیتی ہیں اور ایک مسلمان کے لئے اسے ہر روز کا فریضہ قرار دیتی ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "العبادۃ فی الاسلام" میں یہ بات بیان کی ہے کہ اسلام میں عبادت کا میدان بہت کشادہ ہے۔ اسلام نے اس کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے۔ اس نے اپنے دامن میں ان بہت سے کاموں کو سمو لیا ہے، جن کے بارے میں لوگ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ دین ان کو عبادت اور قرب الٰہی کا ذریعہ بنا دے گا۔

ہر نفع بخش اجتماعی کام کو اسلام بہترین عبادتوں میں شمار کرتا ہے جبکہ اس کا کرنے والا خیر کا طالب ہو، تعریف و توصیف کا متمنی اور لوگوں کے درمیان جھوٹی شہرت کا خواہاں نہ ہو، ہر کام جس سے کوئی انسان کسی غمزدہ کے آنسوؤں کو پوچھتا ہے، کسی دکھیا کے دکھ کو ہلکا

کرتا ہے، کسی مصیبت زدہ کے زخم پر پھایا رکھتا ہے، کسی محروم کے لئے قوت لایموت مہیا کرتا ہے، کسی مظلوم کو سہارا دیتا ہے، ٹھوکر کھا کر گرے ہوئے کسی انسان کو اٹھاتا ہے۔ قرض کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے کسی انسان کا قرض ادا کرتا ہے۔ شریف اور سفید پوش غریب کو سہارا دیتا ہے۔ بھٹکے ہوئے کو راہ دکھا دیتا ہے۔ نادان اور جاہل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتا ہے، کسی پردیسی کو ٹھکانا مہیا کرتا ہے، مخلوق سے برائی کو دور کرتا ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دیتا ہے، کسی زندہ کو کوئی نفع پہنچاتا ہے تو یہ ساری چیزیں، اگر نیت درست ہو تو، عبادت اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔

اس طرح کے بہت سے کام ہیں جنھیں اسلام نے اللہ کی عبادت اور ایمان کے شعبوں میں شمار کیا ہے اور اللہ کے نزدیک ان پر ثواب واجب ہو جاتا ہے۔

اس باب میں جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو پڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے انسان پر بہ حیثیت انسان کے عام عبادتوں کو فرض قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس سے کچھ اور بھی مطالبہ کیا ہے۔ اس کی ہر علامت یا اس کے ہر جوڑ پر عبادت کو فرض قرار دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان کی انگلیوں کے ہر پورے پر صدقہ عائد ہوتا ہے دو انسانوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ جب کوئی انسان کسی انسان کے سوار ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اس کے سامان کو لاد دیتا ہے یا اتار دیتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے، کسی سے اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ ہر قدم جو نماز کے لئے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ہر روز انسان کے ہر جوڑ یا علامت پر عبادت ہے۔ آپؐ کی یہ بات سن کر لوگوں میں سے ایک آدمی نے کہا، یہ بات جو آپؐ نے بتائی ہے بہت ہی مشکل بات ہے! آپؐ نے کہا، معروف کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا عبادت ہے، کسی کمزور کا بوجھ اٹھا لینا بھی عبادت ہے، راستہ سے گندگی کا دور کرنا بھی عبادت ہے۔ ہر قدم جو نماز کے لئے اٹھاتے ہو وہ بھی عبادت ہے۔ (ابن خزیمہ)

ایسی ہی وہ روایت بھی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

انسان کے اندر ۳۶۰ جوڑ ہیں۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ ہر جوڑ کی طرف سے صدقہ کرے۔ لوگوں نے کہا، اے اللہ کے رسول، اس کی طاقت کون رکھتا ہے؟ لوگوں کا خیال تھا کہ صدقہ سے مراد مالی صدقہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسجد میں رینٹ نظر آئے تو اس پر مٹی ڈال دو، یہ بھی صدقہ ہے اور راستہ سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دیتے ہو تو یہ بھی صدقہ ہے۔ (احمد، ابو داؤد، ابن خزیمۃ، ابن حبان)

ان کے علاوہ اور بھی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا اپنے بھائی سے خندہ روئی کے ساتھ ملنا صدقہ ہے نیز بہرے کو کوشش کر کے بات سنا دینا، اندھے کو راہ پر ڈال دینا، گم گشتہ راہ کو راہ بتا دینا، حاجت مند کی حاجت روائی کرنا، پریشان حالوں کی پریشانی دور کرنے کے لئے بھرپور کوشش کرنا، کمزوروں کے بوجھ کو اٹھا دینے اور اسی طرح کے کاموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی عبادت اور اچھا صدقہ

شمار کیا ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان اپنے سماج میں ایسا چشمہ بن کر رہتا ہے جس سے خیر اور رحمت کے سوتے ابلتے ہیں۔ نفع اور برکت کے دھارے رواں ہوتے ہیں۔ وہ بھلائی کے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتا ہے۔ وہ معروف کو پھیلاتا ہے، معروف کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ بھلائی کے لئے کنجی بن جاتا ہے۔ شر کے سوتوں کے لئے ڈاٹ بن جاتا ہے اور اس طرح ابن ماجہ کی اس حدیث کا وہ مصداق بن جاتا ہے۔

طوبیٰ لعبد جعله الله مفتاحا للخیر و مغلاقا للشر

مبارکباد ہے اس بندہ کے لئے جسے اللہ نے خیر کی کنجی اور شر کے لئے ڈاٹ بنا دیا۔

بعض پر جوش افراد کہتے ہیں جو لوگ ان اجتماعی کاموں میں مشغول ہوں گے، وہ دعوت اسلامی کی اشاعت کا کام نہیں انجام دے سکیں گے اور نہ اس رخ سے لوگوں کی ذہنی تربیت کر سکیں گے، جبکہ یہ کام انتہائی اہم اور ضروری ہے۔

میں ان نوجوانوں سے کہتا ہوں۔ یہ اجتماعی کام بھی دعوت ہی کا ایک رنگ اور اسلوب ہے۔ اس سے لوگوں تک دعوت ان کے ماحول میں پہنچائی جاتی ہے۔ دعوت کا یہ کام عمل سے جڑا ہوا ہے۔ دعوت صرف بات چیت کا نام نہیں ہے کہ اسے زبان اور تحریر سے انجام دیا جائے بلکہ لوگوں کے معاملات اور مسائل پر بھی توجہ دینی پڑتی ہے۔ لوگوں کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں تو یہ حل انھیں اسلامی فکر سے قریب کر دیتا ہے۔ امام حسن البنا پر اللہ کی رحمت ہو وہ اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسی لئے ہر دائرہ میں بھلائی اور اجتماعی خدمت کا شعبہ بھی کھولا تھا۔

مزید برآں مسلمان اس بات پر مامور ہے کہ لوگوں کے لئے خیر کو انجام دے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے اللہ کے سامنے جھکنے، سجدہ ریز ہونے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ (الحج: ۷۷، ۷۸)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو، اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو، اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لئے چن لیا ہے۔

یہی مسلمان کی زندگی کا پیام ہے۔ یہ تین شعبوں میں منقسم ہے۔ ایک شعبہ میں اس کے تعلق باللہ کی حد بندی کی گئی ہے اور یہ عبادت میں نمایاں ہوتی ہے۔ دوسرے شعبہ میں سماج سے اس کے تعلقات کی حد بندی کی گئی ہے اور یہ بھلائی کے کاموں میں اجاگر ہوتی ہے اور تیسرے شعبہ میں شر کی قوتوں سے اس کے تعلق کی نوعیت بیان کی گئی ہے اور یہ اللہ کی راہ میں صحیح جہاد سے نمایاں اور اجاگر ہوتی ہے۔ پس ایسی حالت میں جو آدمی سماج میں بھلائی کے کاموں کو انجام دے رہا ہے، وہ وہی کام کر رہا ہے جو اللہ نے اس کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک اجر کا مستحق ہوگا اور لوگوں کے نزدیک قابل تعریف قرار پائے گا۔

بعض پرجوش نوجوان یہ بھی کہتے ہیں کہ مبلغین اسلام کو اپنی تمام کوششیں ایسی اسلامی حکومت کے قیام پر مرکوز کر دینی چاہیئے جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے کرے اور پوری زندگی کو اسلامی بنیادوں پر قائم کرے۔ ملک میں اسلام کو نافذ کرے، باہر اسلام کی تبلیغ کرے اور جب ایسی حکومت قائم ہو جائے گی تو وہ سماج کی ان تمام ضرورتوں اور مطالبوں کو پورا کرے گی، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ جاہلوں کی تعلیم کا نظم کرے گی، بیکار افراد کے لئے کام مہیا کرے گی، معذوروں اور محتاجوں کی کفالت کرے گی۔ مریضوں کے لئے دوا مہیا کرے گی۔ مظلوم کو انصاف دلائے گی، کمزور کے لئے قوت بنے گی...... پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایسی حکومت قائم کرنے کے

لئے کوشش کریں اور اپنے وقت کو جزوی پیوند کاری اور ذیلی اصلاحی کوششوں میں ضائع نہ کریں۔ یہ کوششیں مریض کے لئے خواب آور ٹکیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ان دواؤں کی طرح نہیں ہیں جو مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

ان نوجوانوں سے میرا یہ کہنا ہے کہ بیشک ایسی اسلامی حکومت قائم کرنا جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے کرے۔ اسلام کی بنیاد پر سارے مسلمانوں کو اکٹھا کردے انھیں اسلام کے جھنڈے کے سایہ میں متحد کردے۔ امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ ہم سب کو اس کے لئے کوشش کرنا چاہیئے۔ مبلغین اسلام کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے بہتر راہ اور بہترین طریق کار اپنا کر سکت بھر کوشش کریں تاکہ منتشر کوششیں متحد ہو جائیں۔ شک وشبہ میں مبتلا دلوں کے اندر یقین کی شمع روشن ہو جائے راہ میں پائی جانے والی بیشتر روکاوٹیں دور ہو جائیں۔ مطلوب ہراول دستہ آگے بڑھ سکے نیز ان مبلغین کو بہتر راہ اور بہتر طریق کار اپنا کر مقامی اور عالمی سطح پر رائے عامہ ہموار کرنا چاہیئے تاکہ لوگ اس فکر کو اور اسلامی حکومت کے نظریہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

لیکن یہ ساری باتیں ایک طویل وقت چاہتی ہیں۔ بھرپور صبر چاہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اسباب مہیا ہو جائیں، روکاوٹیں دور ہو جائیں۔ شرطیں پوری ہو جائیں اور نتیجہ سامنے آجائے۔

لیکن جب تک یہ آرزو پوری نہیں ہوتی، لوگوں کو چاہیئے کہ وہ جو کچھ بھلائی کا کام کر سکتے ہیں، کرتے رہیں۔ اپنوں کی اور اپنے اس سماج کی خدمت میں لگے رہیں جس کے درمیان وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ ہر شخص کو اس کی سکت کے مطابق ہی مکلف بناتا ہے۔ ان ہی کاموں کے ذریعہ ہراول دستہ کی بھی تربیت ہوگی۔ اسی عمل کی

بھٹی میں وہ پختہ ہوگا اور اسی میں اس کا امتحان بھی ہو جائے گا کہ وہ سماج پر اثر انداز ہونے اور اس کی قیادت کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک مسلمان کے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک مریض پڑا ہوا ہو۔ کسی قومی یا خیراتی شفا خانہ سے وہ اس کے علاج کا نظم بھی کر سکتا ہو لیکن اس سلسلہ میں وہ تگ و دو سے انکار کر دے اور کہے کہ انتظار کرو۔ یہاں تک کہ جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی تو وہ مریضوں کے علاج کا کام سنبھال لے گی۔

کسی مسلمان کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی نگاہوں کے سامنے غریبوں، بیواؤں اور معذوروں کو دیکھتا رہے۔ جبکہ اسے اس بات پر قدرت بھی حاصل ہو کہ وہ زکوٰۃ فنڈ قائم کر کے ان کی مدد کر سکتا ہو (اس فنڈ میں امیروں سے جو رقم لی جاتی ہے وہ غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے) لیکن وہ اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار نہ ہو اور کہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی تو اجتماعی کفالت کی بنیاد پر وہ اس خدمت کو انجام دے گی۔

کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے چاروں طرف لوگ لڑ جھگڑ رہے ہوں اور وہ تماشائی بنا رہے۔ دشمنی کی آگ ہر رطب و یابس کو جلا کر خاک کرتی رہے اور وہ منتظر رہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہو گی تو لوگوں میں عدل و انصاف کی بنیاد پر صلح صفائی کرا دے گی اور ایسی حالت میں جو گروہ سرکشی پر آمادہ ہو گا، اس سے جنگ کرے گی، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کو تسلیم کرے۔

مسلمان کے لئے جو چیز مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق شر کا مقابلہ کرتا رہے۔ بھلائی کے کاموں کو انجام دیتا رہے۔ رائی برابر بھلائی کا کام انجام دے سکتا ہو تو ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں رہنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو (التغابن: ۱۶)

مطلوب اسلامی حکومت کی مثال میں نے زیتون اور کھجور کے درخت سے دی ہے۔ ان کے پودے جب کسی باغ میں لگائے جاتے ہیں تو کچھ سالوں کے بعد ہی ان سے پھل ملنے کی توقع ہوتی ہے لیکن جب تک کھجور اور زیتون کے یہ درخت پھل نہ دینے لگیں، تب تک باغ کا مالک بیکار پڑا رہتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ ان سبزیوں اور غلوں کی کاشت کرتا ہے جن سے جلد پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی زمین کو شاداب رکھتا ہے۔ اپنے وقت کو آباد رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ایسے کاموں میں مشغول رکھتا ہے جس کا فائدہ اسے اور اس کے پڑوسیوں کو ملتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زیتون اور کھجور کے پودوں کی بھی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ چند سالوں بعد ان کے پھل دینے کا وقت بھی آجاتا ہے۔

مسلمانوں سے حسنِ ظن

اپنے نوجوان بچوں کے لئے میری چھٹی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ آنکھوں سے سیاہ عینک اتار کر لوگوں کو دیکھیں اور یہ فرض کرلیں کہ اللہ کے بندوں میں بھلائی ہے حسن ظن کو مقدم رکھیں اور یہ جان لیں کہ انسان پیدائشی مجرم اور گنہگار نہیں ہے یہی اصل اور بنیاد ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے حالات و واقعات کو بھلائی پر محمول کرنا چاہیئے۔

تین بنیادی باتیں

اس پُر امید رویہ اور سلوک پر قائم رہنے میں جو باتیں معاون اور مددگار بنتی ہیں ان میں درج ذیل تین باتیں بڑی اہم ہیں ــــ ۱۔ لوگوں کے ساتھ معاملات میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ یہ لوگ زمین پر بسنے والے انسان ہیں۔ پروں والے فرشتے نہیں ہیں اور نہ ان کی تخلیق نور سے ہوئی ہے،

انھیں تو سڑی ہوئی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اب اگر یہ غلطی کرتے ہیں تو ہمارے ہی انسان خطا کار ہیں۔ اگر ان سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو ان کے باپ آدم سے بھی گناہ سرزد ہوا تھا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۝

ہم نے اس سے پہلے آدم کو حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ (طٰہٰ : ۱۱۵)

پھر ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ لوگ ٹھوکر کھائیں اور پھر اٹھ جائیں، غلطی کریں اور پھر راہ راست پر آجائیں۔ ہمارے لئے بس یہ ضروری ہے کہ ہم انھیں اللہ کی گرفت سے ڈراتے رہیں اور ان کے سامنے اللہ کی معافی اور مغفرت کا دروازہ کھلا رکھیں۔ حقیقی عالم وہی ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہیں کرتا۔ اللہ کی پکڑ سے بے پروا نہیں بناتا، یہاں ہمارے لئے اللہ کی یہ بات کافی ہے جو اس نے اپنے رسول سے کہی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۝

(اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفور رحیم ہے (الزمر: ۵۳)

دیکھو میرے بندو! کہہ کر اللہ کس طرح لوگوں کو اپنے سے مانوس کر رہا ہے۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اپنی مقدس ذات سے انہیں نسبت دے کر اپنی بارگاہ کا قرب بخشتا ہے اور سارے گناہوں کے لئے معافی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہ گناہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں لیکن اللہ کی بخشش ان سے بھی عظیم تر ہے۔

۲- ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں کے ظاہر پر فیصلہ کریں۔ دل کے بھیدوں کی بات اللہ کے حوالہ کر دیں۔ پس جو شخص یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں تو ہم اسے اس کی ظاہری حالت کے پیش نظر مسلمان تسلیم کریں گے اور اس کے دل کے بھیدوں کو علامُ الغیوب اللہ کے حوالہ کر دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا ارشاد ہے:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں"۔

پھر جب لوگ اس کلمہ توحید کو تسلیم کر لیں گے تو مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیں گے مگر اسی کلمہ کے حق میں، اور ظاہر کے علاوہ باقی باتوں کا حساب ان سے اللہ لے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کے ساتھ جن کے باطنی نفاق کو آپؐ جانتے تھے جو معاملہ کرتے تھے ان کے ظاہر کے مطابق کرتے تھے، آپؐ نے ان پر اسلامی احکام کو جاری کیا۔ حالانکہ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپؐ کے خلاف سازشیں کرتے تھے، چالیں چلتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب کچھ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ان منافقوں کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ان کو قتل کر دینا چاہئے تو آپؐ نے جواب دیا:

"مجھے اندیشہ ہے لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں"۔

۳۔ ہر وہ شخص جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کا باطن نیکی اور خیر کے جذبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کا ظاہر معصیت اور کبائر میں، ڈوبا نظر آئے اور یہ معصیت چاہے کتنی ہی بڑی ہو، ایمان پر خراشیں لگا رہی ہو، نقصان پہنچا رہی ہو لیکن ایمان کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتی۔ جب تک کہ ان کا ارتکاب کرنے والا، اللہ کے اقتدار کو چیلنج کر کے یا اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال بنا کر، یا اس کے اوامر اور نواہی کو بے وقعت سمجھ کر ان کا ارتکاب نہیں کرتا ہے۔

اس سلسلے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے اسوہ ہیں۔ آپؐ گنہگاروں کے لئے بڑے نرم دل تھے، معصیت کے باوجود ان کے لئے آپؐ کا دل کھلا رہتا تھا۔ آپؐ

ان پر اسی طرح شفقت کی نگاہ ڈالتے تھے جس طرح طبیب مریض پر نگاہ ڈالتا ہے۔ اس طرح نہیں دیکھتے تھے جس طرح پولیس مجرم کو دیکھتی ہے۔

ایک قریشی نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ــــــــ آپؐ سے زنا کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرامؓ اس کی اس جرأت پر بپھر گئے اور چاہا کہ اسے سزا دیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور ہی موقف اختیار کیا۔ آپؐ نے اسے قریب بلایا اور کہا، کیا یہ بات تم اپنی ماں کے لئے پسند کرتے ہو۔ نوجوان نے کہا، میری جان آپؐ پر قربان ہو، بخدا میں ماں کے لئے یہ بات کبھی نہیں پسند کر سکتا۔ پھر آپؐ نے اس سے یہی سوال، اس کی بہن، پھوپھی اور خالہ کے بارے میں کیا۔ ہر سوال کے بعد آپؐ اس سے پوچھتے، کیا تم اسے پسند کرتے ہو اور وہ ہر بار یہی جواب دیتا، میری جان آپؐ پر قربان ہو، بخدا میں یہ پسند نہیں کرتا۔ اس کے اس جواب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، اور لوگ بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ پھر آپؐ نے اپنا ہاتھ اس نوجوان کے اوپر رکھا اور دعا کی، اللہ اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ اس کے دل کو پاک کر دے اور اس کی شرمگاہ کو برائیوں سے محفوظ کر دے۔ اس کے بعد وہ نوجوان اس طرح کی کسی برائی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

(احمد، طبرانی)

آپؐ نے اس نوجوان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا اور اس کے تئیں یہ حسن ظن رکھا کہ اس کے باطن میں نیکی کا جذبہ پوشیدہ ہے اور یہ برائی عارضی طور پر اس پر غالب آگئی ہے چنانچہ آپؐ اس سے بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کا ذہن مطمئن ہو گیا اور یہ بات اس کے دل میں اتر گئی کہ زنا بری چیز ہے۔ اسی کے ساتھ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی حاصل ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس آدمی نے کبھی بھی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا،

پھر تو وہ اسی بات کا اہل تھا کہ اس کے ساتھ سختی اور شدت کے بجائے نرمی اور رافت کا سلوک کیا جائے۔

آپ کے سامنے یہ ایک مثال اور پیش کی جا رہی ہے۔ یہ مثال اس غامدی خاتون کی ہے جو محصنہ ہونے کے باوجود زنا کی مرتکب ہو گئی تھی۔ حمل ٹھہر جانے کے بعد، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آئی، تاکہ آپ اس پر حد جاری کر کے اسے پاک صاف کر دیں، وہ برابر اپنے اس موقف پر قائم رہی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس پر حد جاری کی۔ اور جب خالدؓ بن ولید کی زبان سے اس خاتون کے لئے ایک نامناسب لفظ نکل گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان سے کہا، خالدؓ کیا تم اسے گالی دے رہے ہو۔ بخدا اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر گھروں پر اسے تقسیم کیا جائے تو وہ ان کے لئے کافی ہو گی۔ ان سب کو اپنے اندر سمولے گی، کیا اس سے بھی کوئی افضل ہے جس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی سخاوت کی ہے۔ (مسلم)

ایک اور مثال لیجئے۔ یہ ان صحابیؓ کی مثال ہے جو شراب نوشی کے روگ میں مبتلا ہو گئے تھے، ایک سے زائد بار شراب پینے کی حالت میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس لایا گیا۔ ہر بار ان پر مار پڑتی، سزا دی جاتی، لیکن شراب نوشی کی لت یا شیطان غالب آجاتا، پھر شراب پی لیتے، پھر آنحضرتؐ کے پاس ان کو لایا جاتا سزا دی جاتی۔ اس طرح کئی بار ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب انھیں شراب پینے کی حالت میں پکڑ کر لایا گیا تو کسی صحابیؓ نے کہا، کیا بات ہے، اللہ کی اس پر لعنت ہو۔ بار بار اسے لایا جاتا ہے۔!

باوجودیکہ یہ پاپ جنبی کو اپنائے ہوئے تھے، شراب کے رسیا بنے ہوئے تھے لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا تو خاموش نہ رہ سکے

اور لعنت کرنے والے سے کہا، اس پر لعنت نہ بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔ اپنے دینی بھائی کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔

اللہ، ہم کو، آپ کو، اپنی رحمتوں کا سایہ نصیب فرمائے۔ اس وسیع اور بڑے دل کو دیکھئے۔ اس بڑے دل نے کیسے اس انسان کو اپنی شفقتوں کے سایہ میں لے لیا۔ اس کے بارے میں حسن ظن کا اظہار کیا، باوجودیکہ وہ گناہوں میں لت پت تھا۔ ظاہر پر شر کی چھاپ پڑی ہوئی تھی، لیکن دل کی گہرائیوں میں خیر کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا:

"اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے" اسی لئے آپ نے اس پر لعنت کرنے سے منع کیا۔ اس لئے کہ اس سے اس کے اور اس کے اہل ایمان بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی۔ وہ ان لوگوں سے دور ہو جاتا اور وہ لوگ اس سے دور ہو جاتے اور پھر وہ شیطان سے قریب ہو جاتا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؐ نے کہا۔ "اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو" معصیت کے باعث اخوت کا رشتہ ختم نہیں ہو گیا۔ اگرچہ یہ معصیت بڑی تھی اور بار بار اس کا اعادہ ہو رہا تھا، لیکن اسلامی رشتہ نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ یہ عام مسلمانوں سے جڑے ہوئے تھے اور عام مسلمان ان سے جڑے ہوئے تھے۔

جو لوگ عام مسلمانوں کے تئیں بدگمانی رکھتے ہیں اور گنہگاروں کو اپنے اپنے حساب سے ساقط کر دیتے ہیں۔ انہیں اس عمیق نبوی نگاہ کو اور اس بلند تربیت محمدی کو سمجھنا چاہیئے۔ اس سے ان لوگوں کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیئے جو گناہوں کے باعث لوگوں کی تکفیر کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اگر غور وفکر سے کام لیں تو یہ حقیقت ان

کے سامنے آجائے گی کہ جن کی وہ تکفیر کرتے ہیں وہ مرتد نہیں ہیں کہ ان کا قتل واجب ہو، وہ دین کی حقیقت سے جاہل ہیں اور ضروری ہے کہ انہیں اس سے آگاہ کیا جائے یا بری صحبت اور برے ماحول کے باعث وہ معصیت میں لت پت ہو گئے ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں اس سے بچایا جائے یا دنیا کے کام دھندوں میں پھنس کر آخرت سے غافل ہو گئے ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں آخرت سے آگاہ کیا جائے اور آخرت کی یاد دلائی جائے۔ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

ورنہ اگر لوگوں پر صرف لعنت کی جائے، تو اگرچہ وہ گنہ گار اور راہ راست سے بھٹکے ہی ہوئے کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہ لعنت نہ ان کی اصلاح کر سکتی ہے اور نہ انہیں خیر اور نیکی سے قریب کر سکتی ہے بلکہ یہ لعنت ان کو لوگوں سے اور دور کر دے گی۔ لہٰذا اس سلبی موقف سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم اپنے گنہگار بھائی کے پاس جائیں۔ اسے نیکی کی طرف بلائیں، دعائیں دیں اور اسے اس طرح نہ چھوڑ دیں کہ وہ شیطان کا شکار بن جائے۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ "تاریکی پر لعنت بھیجنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ایک شمع جلا دو۔ وہ راستہ کو روشن کر دے گی۔"

یہی وہ نصیحت ہے جو میں اپنے پرجوش نوجوان مسلم بچوں کو کرنا چاہتا تھا، ان کے لئے میرے دل میں محبت کا گہرا جذبہ ہے، بڑی شفقت ہے اور اب میں اپنی بات خطیب انبیاء شعیب علیہ السّلام کی بات پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

(ہود: ۸۸)

میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

٭

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (پ:۱۹۲۶ء) دنیاے اسلام کے
ذہین و درّاک مصنف اور علم فقہ کے مجتہد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔
موصوف اپنے وطن مصر میں پیدا ہوئے، دس سال کی عمر میں حفظ قرآن حکیم
کیا، ۱۹۵۳ء میں جامعہ ازہر سے ''اصول الدّین'' میں عالمیت کی سند حاصل کی،
۱۹۵۸ء میں عربی زبان و ادب کا ڈپلوما کیا اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ ازہر کے ''کلیۃ
اصول الدّین'' سے ''اجتماعی مسائل کے حل میں زکوٰۃ کے اثرات'' کے موضوع
پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔
ڈاکٹر قرضاوی قطر یونی ورسٹی کے شریعت کالج اور اسلامک اسٹڈیز کے پرنسپل
رہ چکے ہیں۔ اس وقت اسی یونی ورسٹی میں مرکز تحقیقات سنت و سیرت نبی ﷺ
کے بانی ڈائریکٹر اور اسلامی بنکوں کے عالمی فیڈریشن کی مجلس اعلیٰ کے رکن ہیں۔
موصوف نے اسلامی تحقیقات کے مختلف پہلوؤں پر تیس سے زائد کتابیں
تالیف کی ہیں، جن میں سے بیشتر کے ترجمے مختلف عالمی زبانوں میں ہو چکے
ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ''فقہ الزکوٰۃ'' ہے۔ جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
نے ''فقہ اسلامی کی اس صدی کی کتاب'' قرار دیا ہے۔ ''الحلال والحرام''
بھی مشہور کتاب ہے۔